اخلاقی کہانیاں

اخلاقی کہانیاں

بچّوں کے لیے

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

چار سال کا بُوڑھا

ایک دن ایران کا مشہور بادشاہ نوشیرواں کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بُوڑھا ملا جسے دیکھ کر بادشاہ نے پوچھا: ”بڑے میاں !تمہاری عُمر کتنی ہو گی؟“

بوڑھے نے جواب دیا۔ ”جہاں پناہ کی عُمر اور دولت زیادہ ہو، اِس گنہگار

کی عمر صرف چار سال کی ہے۔"

نوشیرواں نے کہا۔ "ہیں؟ یہ بڑھاپا اور اتنا جھُوٹ؟ تمہاری عُمر اسّی برس سے کم نہیں ہو سکتی۔" بُوڑھے نے جواب دیا۔ "جہاں پناہ ! حضورِ والا کا اندازہ بہت درست اور بالکل صحیح۔ مگر اسّی میں سے چھہتر سال اِس عاجز نے یوِنہی گنوا دیے جن میں صرف اپنا اور بال بچّوں کا پیٹ پالنا ہی کام سمجھتا رہا۔ اِس کے سوا نہ کوئی نیکی کمائی، نہ کسی غریب کی مدد کی۔ اب چار سال سے یہ عقل آئی ہے کہ ہم لوگ فقط اپنے ہی لیے پیدا نہیں ہوئے۔ بلکہ دوسروں کا بھی ہم پر کوئی حق ہے۔ اور اب اِس پر عمل کر رہا ہوں۔ اِس لیے اصلی عُمر صرف چار ہی سال کی سمجھتا اور گِنتا ہوں۔ باقی فضول۔"

بُوڑھے نے کیسی اچھّی بات کہی کہ جب تک آدمی اپنے کام کو نہ سمجھ لے، آدمیوں میں نہیں گِنا جا سکتا۔ بزُرگی عقل پر ہے، عُمر پر نہیں۔ اور

سخاوت دِل پر موقوف ہے، مال داری پر نہیں۔ جو لوگ اِن باتوں کو پہلے سے سمجھ لیں۔ اُن کی کِسی بات سے دوسروں کو تکلیف نہیں پُہنچتی۔ بلکہ وہ ہمیشہ کمزوروں اور غریبوں کی مدد کر کے بھلائیاں حاصل کرتے رہتے ہیں۔

کام کرنے کی برکت
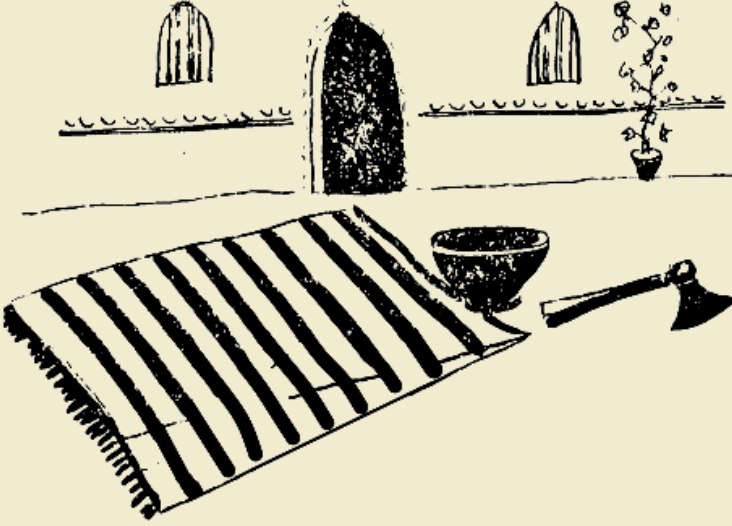
پیغمبرِ اسلامؐ کے پاس ایک غریب آدمی نے جا کر عرض کی۔ ”میرا ہاتھ بہت تنگ ہے۔ کوئی ایسی تجویز بتا دیجیے کہ یہ تنگی جاتی رہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کُچھ تمہارے پاس ہے۔ بھی؟“ اس نے کہا۔ ”صرف ایک دری اور ایک لکڑی کا پیالہ۔“

فرمایا۔ ”دونوں چیزیں لے آؤ۔ غریب اُسی وقت دری اور پیالہ لے آیا۔ آپ نے وہیں بیٹھے بیٹھے کِسی کے ہاتھ آٹھ آنے میں بیچ دیا اور اُسے دام دے کر فرمایا۔ ”اِس میں سے چار آنے کی تو ایک کلہاڑی لے آؤ اور چار آنے کا آٹا آج کے لیے گھر میں دے آؤ۔“

تھوڑی دیر میں جب وہ آٹا گھر پہنچا کر اور کُلہاڑی لے کر آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اُس میں لکڑی کا دستہ لگا دیا اور فرمایا۔ ”جاؤ ہر روز جنگل میں جا کر اِس سے لکڑیاں کاٹ لایا کرو اور اُنہیں بیچ کر گھر کا خرچ چلایا کرو۔ پندرہ دِن بعد پھر آنا اور ہمیں اپنا حال سُنا جانا۔“

غریب نے پندرہویں دِن آکر عرض کی۔ ”گھر کا خرچ چلا کر اِس وقت میرے پاس دو روپے موجود ہیں۔“

آپ بہت خوش ہوئے اور وہ شخص تھوڑے عرصے میں خوش حال ہو گیا۔

میں کیوں نہیں پڑھ سکتا؟

آج کل تو کتابیں بہت سستی مل جاتی مگر پہلے زمانے میں یہ بات نہ تھی۔ فقط بڑے بڑے گھرانوں میں کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ ہاتھ سے لکھے جانے کے باعث قیمتیں بہت زیادہ ہوتی تھیں۔

ایک بادشاہ کے پاس چند کتابیں پڑی تھیں۔ جِن میں لکھائی کے علاوہ جگہ جگہ خوب صورتی کے لیے تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں، ایک دِن ملکہ کتابیں دیکھ رہی تھی اور اُس کے چاروں چھوٹے بیٹے بھی بیٹھے تھے۔

اُنھوں نے کہا۔ ”امّی جان! یہ کتابیں ہمیں بھی دِکھاؤ۔“

ماں نے کتابیں دِکھائیں تو تین بیٹے صرف تصویروں کو دیکھ کر خوشی کے ساتھ ورق پلٹتے رہے مگر چھوٹے لڑکے نے کہا۔ ”اِن میں لکھا کیا ہے؟“

ملکہ نے کہا۔ ”بیٹا! اِس میں ہمارے ملک کی جنگی کہانیاں لکھی ہیں۔“

چھوٹے بچے نے کہا۔ ”میں انہیں کیوں نہیں بڑھ سکتا؟“

ملکہ نے فرمایا۔ ”بیٹا! لکھی ہوئی چیزیں صرف علم والے ہی پڑھ سکتے ہیں اور علم محنت سے آتا ہے۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”تو میں ضرور پڑھوں گا۔“

ملکہ نے کہا۔ ”جب تم پڑھ لو گے تو جو کتاب چاہو گے میں خوشی سے تمھیں دے دیا کروں گی۔“

شہزادے نے محنت کرنی شروع کی تو تھوڑی ہی مدّت میں کتابیں پڑھنے اور خط لکھنے لگا۔ جِس پر ماں نے بھی اپنا سارا کُتب خانہ اُسی چھوٹے لڑکے کو دے دیا۔ شہزادہ الفرڈ اعظم تھا جو انگریزوں میں ایک مشہور عالِم بادشاہ گزرا ہے۔

میں جھُوٹ نہ بولوں گا

ایک شریف آدمی نے نہایت شوق سے گھر کے پاس ایک چھوٹا سا باغ لگا رکھا تھا جسے وہ ہر روز اپنے ہاتھ سے سینچتا۔ ایک دِن وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا کہ اُس کا چھوٹا لڑکا ہاتھ میں آری لیے باغ کی سیر کو نکلا اور اُس نے آری کو آزمانے آزماتے ایک سب سے اچھّا درخت کاٹ دیا۔

شام کو باپ نے آکر باغ کو دیکھا تو اُس درخت کو کٹا ہوا پا کر بہت غصّے ہوا

اور ہر ایک سے پوچھنے لگا کہ یہ درخت کِس نے کاٹا ہے۔

اِتنے میں بیٹا بھی آ گیا۔ باپ نے اپس سے پوچھا تو اُس نے صاف کہہ دیا۔ ”آپ ناراض تو ہوں گے مگر میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ یہ درخت میں نے ہی کاٹا ہے۔“

باغ کا شوقین باپ یا تو اتنا غصّے ہو رہا تھا یا اُس نے نہایت خوشی سے بیٹے کو گود میں اُٹھا لیا اور کہا۔ ”بیٹا مُجھے تمہاری سچّائی سے اتنی خوشی ہوئی کہ درخت کٹ جانے کا رنج اُس کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ شاباش !اِسی طرح ہمیشہ سچ بولا کرنا۔“

باپ کے اِس معاف کر دینے اور شاباش دینے کا لڑکے کے دِل پر اتنا اثر ہوا کہ اُس نے عُمر بھر کبھی جھوٹ نہ بولا۔ ہوتے ہوتے اُس کی سچّائی سارے شہر میں مشہور ہو گئی۔

اُس لڑکے کا نام جارج واشنگٹن تھا۔ جس نے امریکہ کو آزاد کرایا اور وہی اِس بہت بڑے مُلک کا سب سے پہلا صدر چُنا گیا۔ امریکہ کے صدر مقام کا نام بھی اُسی لڑکے کے نام پر رکھا گیا ہے۔

غیرت

ایک عورت کے دو جوان بیٹے تھے۔ ایک تو پڑھ لکھ کر کسی دفتر میں نوکر ہو گیا اور دوسرا شہر میں راج کا کام کرنے لگا۔ بابُو تو کوٹ، پاجامہ، صدری اور ٹوپی پہنتا اور راج گیری کرنے والا تہ بند، کُرتہ، صدری اور پگڑی۔

ایک دفعہ جاڑے کا موسم آیا اور بابُو کے لیے ماں نے کشمیرے یا پٹّو کا کوٹ بنوایا تو راج نے کہا۔ "امّاں جان! مُجھے بھی اَیسا ہی کوٹ بنوا دو۔

ماں نے کہا۔ ”بیٹا! ایسے کپڑے تمہارے پہننے کے نہیں۔ یہ تو مُنشی بابُوؤں ہی کو سجتے ہیں۔ سردی کا خیال ہے تو مرزئی بنوالو۔ تُم اینٹ گارے کا کام کرنے والے ہو کوٹ اور پاجامہ بھلا وہاں کیا کام دے گا۔“

ماں کی یہ بات سُن کر غیرت والے بیٹے نے دِل میں کہا۔ ”افسوس میں نے کیوں نہ پڑھ لیا کہ اب بھلے مانسوں کے سے کپڑے بھی نہیں پہن سکتا۔“

یہ سوچ کر اُس نے پہلے تورات کے وقت کسی سے پڑھنا شروع کیا۔ جب اچھّی طرح حرف پہچاننے لگا تو راج گیری چھوڑ مدرسے میں داخل ہوا اور بارہ برس میں ایم اے پاس کر کے کسی اچھّے عہدے پر نوکر ہو گیا۔

لالچ کی سزا

ایک غریب آدمی کے مکان کی چھت ٹوٹ گئی تھی اور وہ اُس پر گھاس پھونس بچھا رہا تھا کہ اتّفاق سے ایک سخی امیر بھی اُدھر آنکلا اور کہا۔

"بھلے آدمی! اِس گھاس پھونس سے بارش کیا رُکے گی۔ پکّی چھت بنوالو تو ٹپکنے کا اندیشہ جاتا رہے۔"

غریب نے جواب دیا۔ "جناب! آپ کا فرمانا تو بے شک بجا ہے اور میں

بھی جانتا ہوں۔ مگر حضور! میرے پاس پکّی چھت بنوانے کے لیے دام کہاں؟"

امیر نے پوچھا: "پکّی چھت پر کیا لاگت آئے گی؟"

غریب نے جواب دیا۔ "جناب! ڈیڑھ سو روپے تو لگ ہی جائیں گے۔"

یہ سُن کر امیر نے جھٹ جیب میں سے ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ نکال اُس غریب کے حوالے کر دیے کہ جاؤ اِس سے اپنا کام چلاؤ۔

جب امیر نوٹ دے کر چلا گیا تو غریب کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے کہ یہ تو بڑا سخی دولت مند تھا۔ اگر میں پانچ سو کہہ دیا اُتنے ہی دے جاتا۔ میں نے غَلَطی سے کم کہہ دیا۔

یہ سوچ کر وہ امیر کے مکان پر پہنچا اور کہنے لگا۔ "جناب! میں نے اندازے میں غَلَطی کی تھی۔ چھت پر پانچ سو روپے خرچ آئیں گے۔"

امیر نے کہا۔ ”وہ ڈیڑھ سو کہاں ہیں؟“

غریب نے نوٹ نکال کر پیش کیے تو امیر نے اپنی جیب میں رکھ کر کہا۔ ”جاؤ۔ مُجھے اِتنی توفیق نہیں کہ پانچ سو دے سکوں۔ کوئی اور اللہ کا بندہ دے دے گا۔“

غریب بہت گھبرایا مگر امیر نے ایک نہ سُنی۔ آخر پچھتاتا اور یہ کہتا ہوا گھر کو پلٹ آیا کہ۔ ”امیر کی کوئی خطا نہیں۔ یہ میرے ہی لالچ کی سزا ہے۔“

سچّائی کا انعام

ایک کسان کے کھیت میں کسی امیر کے گھوڑے گُھس گئے جنھوں نے کُچھ تو روند کر اور کُچھ چر کر کھیت کا ستیاناس کر دیا۔

کَسان غصّے سے بھرا ہوا امیر کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کے گھوڑوں نے میرا کھیت تباہ کر دیا ہے۔

امیر نے کہا۔ ”تمہارے خیال میں کتنا نقصان ہوا ہو گا؟“

کسان نے کہا۔ ”پچاس روپے کا۔“ امیر نے اُسی وقت کسان کو پچاس روپے دے کر کہا۔ ”اگر نقصان کُچھ زیادہ ہوا ہو تو پھر سوچ لینا۔ میں زیادہ دینے کو بھی تیّار ہوں۔“

کسان پچاس روپے لے کر گھر آ گیا۔ لیکن کھیت پک کر پہلے سے بھی زیادہ قیمت پر بِک گیا۔ جس پر ایمان دار کسان نے امیر کے پاس پچاس روپے لے جا کر کہا۔ ”جنابِ عالی! فصل کٹ گئی اور نقصان کی جگہ کُچھ نفع بھی ہو گیا ہے۔ پس اب آپ اپنے روپے واپس لے لیں۔“

یہ سُن کر امیر نے اُن پچاس روپوں کے ساتھ پچاس ہی اور ملا کر کسان کو پورے سو روپے دے دیے اور کہا۔ ”یہ نقصان کا بدلہ نہیں، تمہاری ایمان داری کا انعام ہے۔ شوق سے لے جاؤ اور اسی طرح ہمیشہ سچّائی پر قائم رہو۔“

بادشاہ اور غریب میں فرق

ایک بادشاہ خود تو رحم دِل اور نیک مزاج تھا۔ مگر اُس کا بیٹا اتنا بے رحم اور تلخ مزاج کہ جب دیکھو غصّے میں تیوری چڑھائے ہوئے نوکروں کو ڈانٹتا ڈپٹتا مارتا پیٹتا ہی نظر آتا۔ بادشاہ کو یہ خبریں پہنچتیں تو بہت رنج ہوتا۔ بہتیرا اِشاروں میں سمجھاتا، مگر بیٹے پر ذرا اثر نہ ہوتا۔

تھوڑے عرصے بعد شہزادے کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اتّفاق دیکھے کہ اُس

کے خدمت گار کے گھر بھی عین اُسی وقت لڑکا ہوا۔

بادشاہ نے محل میں جا کر دونوں لڑکوں کو ایک پلنگ پر لِٹا دیا اور شہزادے کو بُلا کر کہا۔ تُم اِن میں سے اپنا لڑکا پہچان لو۔

شہزادے نے دونوں لڑکوں کو ایک سا دیکھ کر جواب دیا۔ ”میں تو نہیں پہچان سکتا۔“

باپ نے کہا۔ ”کیا غریب اور بادشاہ میں کوئی فرق نہیں۔“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”مُجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔“

باپ نے فرمایا۔ ”بے شک کوئی فرق نہیں۔ اور جب خُدا نے کوئی فرق نہیں رکھّا تو تم کیوں فرق رکھتے ہو؟“

شہزادہ شرمندہ ہو گیا اور اُس کے بعد نوکروں پر کبھی سختی نہ کی۔

دِل اور زبان

کہتے ہیں جب حکیم لُقمان پڑھ کر فارغ ہو چکے تو اُستاد نے کہا۔ ”لقمان!
آج ایک بکرا ذبح کرو اور اُس میں سے جو سے اچھّی چیز سمجھو، ہمارے
لیے پکالاؤ۔“

لُقمان نے بکرا حلال کر کے اُس کے دِل اور زبان کو خوب اچھّے مسالوں کے ساتھ بھون بھان کر اُستاد کے سامنے رکھ دیا۔ اُستاد نے چکھّا تو تعریف کر کے کہا۔ ”لُقمان آج تُم آدھے پاس ہو گئے۔“

دُوسرے دِن اُستاد نے فرمایا: ”آج پھر ایک بکرا ذبح کرو اور اُس میں جو سب سے بُری چیز پاؤ، وہ ہمارے لیے تیّار کر لاؤ۔“

اُنھوں نے بکرا ذبح کر کے اب بھی پہلے دِن کی طرح صِرف دِل اور زبان ہی کو چُن لیا۔ مگر اب کے اِس ترکیب سے پکایا کہ زبان میٹھی پکائی اور دِل کڑوا۔ اور پھر دونوں کو ملا کر اُستاد کے سامنے لا رکھا۔ استاد نے چکھّا تو بد مزہ پا کر پوچھا۔ ”لقمان! آج کیا پکا لائے؟“ لُقمان نے عرض کی۔ ”حضُور! وہی دِل اور زبان جو آپس میں مُوافق نہیں۔“ اُستاد نے فرمایا۔ ”جاؤ! اب تُم بالکل پاس ہو۔“

حکیم لُقمان نے دونوں دفعہ کیسی اچھّی چیزیں چُنیں۔ سچ مُچ ایک جیسے دِل اور زبان سے بڑھ کر کوئی نعمت لطیف اور لذِیذ نہیں اور نہ ایک دوسرے سے مخالف دِل اور زبان سے زیادہ کوئی چیز بُری اور بدمزہ ہے۔ جس آدمی کا دِل اور زبان ایک ہو، دُنیا بھی اُس کی عزّت کرتی ہے۔ خُدا بھی خُوش ہوتا ہے اور جِس کی زبان دِل سے مُوافق نہ ہو۔ دُنیا بھی اُسے اچھّا نہیں سمجھتی۔ خُدا بھی ناخوش ہو جاتا ہے، بلکہ وہ خود بھی خوش نہیں رہتا۔

خیالی پُلاؤ

شیخ چِلّی ایک مشہور آدمی گزرا ہے۔ جس کی بے وقوفی کی کہانیاں تُم نے بھی سُنی ہو گی۔

ایک دِن شیخ چِلّی بازار میں جا رہا تھا کہ کِسی سپاہی نے تیل کا کُپّا خرید ا اور اُسے بُلا کر کہا۔ ”ارے میاں! یہ کُپّا اُٹھا کر ہمارے گھر تک لے چلو۔ دو آنے مزدوری دیں گے۔“

شیخ چِلّی نے بہت اچھّا کہہ کر کُپّا تو سَر پر اُٹھا لیا اور دِل میں خیالی پلاؤ پکانا شروع کیا کہ "یہ دو آنے ملیں گے تو ایک مُرغی خریدوں گا اور پھر اُس کے انڈوں سے بہت سے بچّے نکلیں گے۔ پھر اُنہیں بیچ کر ایک بکری لے لُوں گا۔ اُس کے بڑھتے بڑھتے بہت سے ہو جائیں گے۔ انہیں بیچ کر ایک بھینس اور بھینس کو بیچ کر زمین خرید لوں گا۔ اتنے میں بیاہ ہو کر کئی بال بچّے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ میں جب کھیت پر سے بھینس کے لیے چارے کا گٹھّا سَر پر اُٹھا کر گھر میں آیا کروں گا تو بال بچّے ٹانگوں سے چمٹ جائیں گے کہ ابّا آئے۔ ابّا آئے۔ میں جھِڑک کر ہٹو ہٹو کہتا ہوا گٹھّا زمین پر پٹک دوں گا۔"

یہ خیال آتے ہی شیخ نے تیل کے کُپّے کو چارے کا گٹھّا سمجھ کر زمین پر دے مارا اور تیل سارے کا سارا زمین پر لُنڈھ گیا۔

تیل کے مالک نے کہا۔ "ارے نالائق! کیا بھنگ پیے ہوئے ہے کہ دَس

روپے کا تیل گرا کر سب خاک میں ملا دیا۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "تُم تو دس ہی روپے کو روتے ہو۔ میرا سارا کُنبے کا کُنبہ غارت ہو گیا ہے۔"

اچھّا لباس اور اچھّا شکار

ایک شہزادے کو اچھّی پوشاک پہننے کا اتنا شوق تھا کہ روز قسم قسم کے لباس بنواتا اور طرح طرح کی پوشاکیں پہنے ہر وقت سیر و شکار میں لگا رہتا۔

ایک دِن باپ نے فرمایا۔ ”بیٹا تُم شہزادے ہو۔ تمہیں ایسا لباس پہننا

چاہیے جو دوسروں کو نہ مل سکے۔ یہ قیمتی کپڑے جِن پر تُم اکڑتے پھرتے ہو، ہر شخص بنوا سکتا ہے۔"

شہزادے نے عرض کی۔ پھر وہ لِباس کون سا ہے؟ جو دوسروں کو نہیں مل سکتا؟"

فرمایا۔ "وہ نیکی اور پرہیز گاری کا لباس ہے، جو ہر ایک کو نہیں مل سکتا؟ یہ زری کے کپڑے تھوڑے دِنوں میں پُرانے ہو جاتے ہیں۔ مگر نیکی اور پرہیز گاری کا لباس ہمیشہ نیا رہتا ہے۔ نہ کبھی پھٹے اور نہ میلا ہو۔"

"اِسی طرح ہرن، پاڑے، بارہ سنگھے، شیر اور چیتے کا شکار بھی سبھی کر سکتے ہیں۔ لیکن تمہیں ایسا شکار کرنا چاہیے جو دوسرے نہ کر سکیں۔"

شہزادے نے پوچھا۔ "وہ شکار بھی فرما دیجیے۔"

فرمایا۔ "رعایا کے دِلوں کا شکار۔ اپنی رعایا کے دِل جیت لو۔ یہ وہ شکار ہے

جو ہر کوئی نہیں کر سکتا۔"

احسان کی قید

لوگوں نے ایک دانا سے کہا۔ "کل فلاں شخص آپ کی نسبت ایسی بُری بُری باتیں کہہ رہا تھا، جو آپ کو سخت بدنام کرنے والی ہیں۔"

دانا نے فرمایا۔ "تُم لوگ تو اچھّی طرح مُجھ سے واقف ہو۔ کیا اِن باتوں کے متعلّق تمہیں یقین آسکتا ہے کہ وہ درست ہیں؟"

اُنھوں نے کہا: "ہرگز نہیں۔ مگر جناب ہر شخص تو اِتنا واقف نہیں کہ

اُس کے سچ جھوٹ میں تمیز کر سکے۔ بہتر ہے کہ اُس کی زبان کو ادب کی لگام دے دی جائے۔"

دانا نے جواب دیا۔ "میں حاکم نہیں کہ سزا دے سکوں۔ بیکار نہیں کہ نالش کر کے سزا دِلا سکوں۔ پس کوئی اور ہی تدبیر مناسب ہے۔"

تھوڑی ہی دیر گُزری تھی کہ بد زبان بھی آ گیا اور دانا نے اُس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ شربت پِلوایا۔ پنکھا جھلوایا اور اُس کے خوش کرنے کی ایسی باتیں کیں، جِن سے وہ نہایت خوش ہو کر واپس گیا۔

اُس کے چلے جانے پر شکایت کرنے والوں نے کہا۔ "آپ نے یہ کام بالکل عقل کے خلاف کیا کہ ایسے بد زبان دُشمن کی اتنی خاطر داری کی۔"

دانا نے جواب دیا۔ "تُم سمجھے نہیں کہ میں نے کِس طرح اُس کے دِل کو

اخلاق کے جیل خانے میں اور زبان کو ادب کی زنجیر میں قید کر لیا ہے۔
بس اب دو چار ملاقاتوں میں یہ قید اور بھی سخت ہو جائے گی۔ جس کے
بعد اسے میرے خلاف کہنے کی کبھی ہمّت نہ رہے گی۔“

بے فکری

ایک دِن اکبر بادشاہ دربار لگائے بیٹھا تھا کہ ایک ہاتھی کے بے قابو ہو کر چھوٹ جانے سے ہٹو بچو کا غُل ہونے لگا۔ بادشاہ نے کھڑکی کی طرف مُنہ کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان نے دوڑتے ہوئے ہاتھی کی دُم پکڑ کر اُسے فوراً روک لیا ہے۔ بادشاہ نے بیربل کو اُس کی شہ زوری کا تماشا دِکھا کر پوچھا۔ ”کُچھ سوچو تو سہی۔ اِس میں اتنا زور کہاں سے آ گیا۔“ بیربل نے

عرض کی۔ ”جہاں پناہ ! یہ صرف بے فکری کا زور ہے۔“

بادشاہ کو وزیر کی اِس بات پر تعجّب ہوا کہ بے فکری سے اِتنی قوّت کیونکر آگئی۔

بیربل نے فوراً شہ زور جوان کو دربار میں بُلوا کر کہا۔ ”جہاں پناہ تُمہاری شہ زوری دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آج سے ایک روپیہ روزانہ تمہیں تنخواہ ملا کرے گی اور کام صرف یہ ہے کہ شہر کے باہر فلاں خانقاہ پر ٹھیک شام کے وقت چراغ جلا آیا کرو۔ لیکن یاد رہے کہ اگر ایک دِن بھی وقت آگے پیچھے پہنچو گے تو پھانسی دے دی جائے گی۔“

نوجوان سُن کر آداب بجالایا اور ہدایت کے مطابق ہر روز خانقاہ پر چراغ جلانے لگا۔ مگر تھوڑے دِنوں کے بعد جب ایک بیل چھوٹ گیا اور نوجوان نے اُس کی بھی دم پکڑنی چاہی تو بیل کو ٹھہرانے کی جگہ خود ہی

دور تک گھسٹتا ہوا چلا گیا اور جب وہ دُم چھڑا کر بھاگا تو یہ دھم سے زمین پر آ گرا۔

بادشاہ نے دیکھ کر فرمایا۔ ”واقعی فکرمندی بڑی بُری چیز ہے۔“

گھر کی باتیں

ایک شیخی باز لڑکے کو ہر بات میں شیخی بگھارنے کی عادت تھی اور گھر کی اِیسی اِیسی باتیں بھی بڑھا چڑھا کر بتاتا رہتا جو نہیں بتانی چاہئیں۔ اُن میں اکثر اپنی امیری اور دولت مندی کے قصّے ہوتے۔

ایک دِن مدرسے سے آتے ہوئے اُس کا کوٹ جو ایک طرف سے اُدھڑا

ہوا نظر آیا تو لڑکوں نے کہا۔ ”بس دیکھ لی تمہاری امیری، کوٹ تک پھٹا ہوا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”مجھے آج صُبح خیال ہی نہیں آیا، ورنہ کوئی اور کوٹ بدل آتا۔ صرف یہی کوٹ تو نہیں۔ سچ جاننا کہ ہمارے پاس کوٹوں کی ایک پوری الماری اور نوٹوں کا ایک کالا بکس اَٹا ٹٹ بھرا رکھا ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”نوٹ ہیں یا نوٹ پیپر جو اَٹا ٹٹ بھرے رکھے ہیں۔“

شیخی باز بولا: ”تو گویا تُم نے میری بات جھوٹ سمجھی؟ خُدا گواہ ہے، کوٹوں کی الماری میں نوٹوں کا ایک سیاہ بکس بھرا رکھا ہے۔“

اتّفاق سے یہ باتیں اُس وقت کوئی چور بھی سُن رہا تھا۔ وہ چُپکے سے اُس کے پیچھے ہو لیا اور لڑکے کا مکان دیکھ آیا۔ جس کے چند دِن بعد اُن کے ہاں چوری ہو گئی۔ اور وہی نوٹوں کا سیاہ بکس چور اُٹھا کر لے گئے۔

ایسے ہی کسی جج صاحب کا لڑکا حکُومت جتانے کے لیے روز کہہ دیا تھا۔

”رات ہمارے ہاں ایک شخص آموں کا ٹوکرا لایا تھا اور کل ایک آدمی خربوزوں کا یکّہ بھر کر دے گیا تھا۔ اب بھی کہیں سے ایک گھی کا کنستر آ گیا ہے۔“

یہ باتیں سچ تھیں یا غَلَط۔ مگر تمام جج کو بد دیانت جاننے لگے اور جب چرچا ہو کر حاکموں تک خبر پُہنچی تو بے چارے جج صاحب یوِنہی مُفت میں بدل دیے گئے۔

آج کا کام نہ رکھّو کل پر

ایک دفعہ کسی گاؤں کا چودھری سودا لینے شہر میں آیا تو دیکھا، کسی جگہ لوگ ایک وکیل کی بڑی تعریف کر رہے ہیں کہ تو سو سو روپے کی ایک ایک بات بتاتا اور ہزار ہزار روپے کا ایک ایک نکتہ سُجھاتا ہے۔

چودھری نے دِل میں کہا۔ ”ہم بھی چل کر اُس کی کوئی بات سُن آئیں تو بہت اچھّا ہو۔“

یہ سوچ کر وہ وکیل کے مکان پر پہنچا اور کہا۔ ”وکیل صاحب! میں نے آپ کی باتوں کی بہُت تعریف سُنی ہے۔ کوئی بات مُجھے بھی سُنا دیجیے۔“

وکیل نے کہا۔ ”ہم تو ایک بات کی فیس ایک اشرفی لیا کرتے ہیں۔“

یہ سُن کر چودھری کا شوق اور بھی بڑھا اور اُس نے پندرہ روپے نکال وکیل صاحب کے سامنے رکھ دیے۔

روپے لے کر وکیل صاحب نے ایک کاغذ کے پرزے پر یہ مصرع لکھ دیا۔ ”آج کا کام نہ رکھّو کَل پر۔“

چودھری واپس آیا تو مزدوروں نے کھیت کاٹ کر بہت سا غلّہ نکال رکھا تھا۔ شام کو وہ چودھری سے مزدوری لینے آئے تو اُس نے کہا” :اِس اناج کو گھر میں پہنچاؤ گے تو مزدوری ملے گی۔“

مزدوروں نے کہا۔ ”اب تو وقت گُزر چُکا ہے۔ کل دِن نکلتے ہی رکھوا لینا۔

دوسروں کے اناج بھی تو سب باہر ہی پڑے ہیں۔"

چودھری بولا۔ "بھائیو! میں نے تو آج ہی پندرہ روپے دے کر یہ بات سیکھی ہے۔ پس میں تو اِسی وقت رکھواؤں گا۔"

آخر مزدوروں کو اناج گھر میں رکھنا ہی پڑا۔

اتّفاق سے اُسی رات اِس زور کی بارش ہوئی کہ سارے گاؤں والوں کا غلّہ پانی میں بہہ گیا یا خراب ہو کر رَہ گیا۔ مگر چودھری کا غلّہ بالکل بچا رہا اور بیچتے وقت اُسے اِتنا نفع ہوا کہ ایک اشرفی کے بدلے بیسیوں اشرفیاں موصول ہو گئیں۔

ہاتھی کے گلے میں ڈھولک
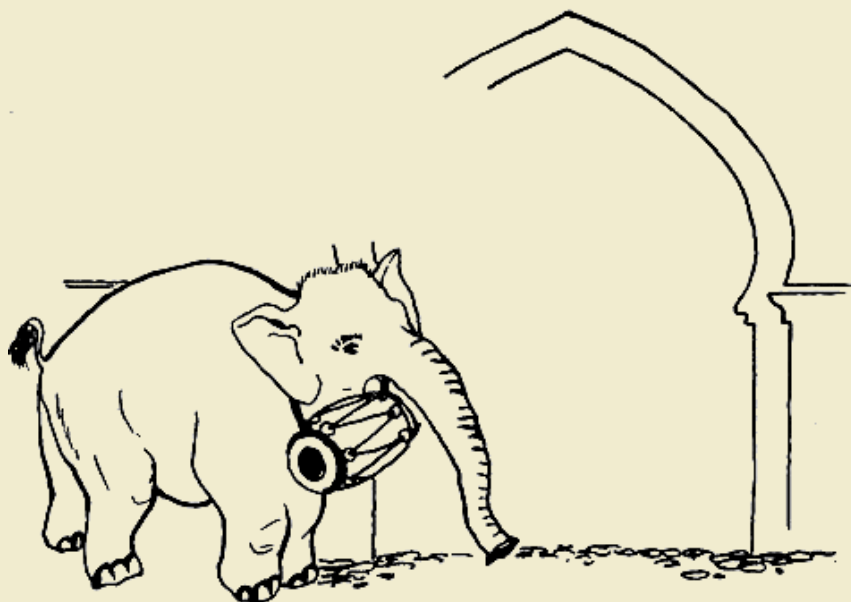
ایک دفعہ مہاراجا رنجیت سنگھ نے کسی پر خوش ہو کر روپے اور خِلعت کے

ساتھ اُسے ایک ہاتھی بھی بخش دیا۔

مہاراجا نے تو بڑی فیّاضی دکھائی۔ مگر مِیراثی بہت گھبرایا کہ اِسے روز

دانہ چارہ کہاں سے کِھلاؤں گا اور خدمت کے لیے نوکر کہاں سے لاؤں

گا۔

کُچھ سوچنے کے بعد میراثی نے ایک ڈھولک ہاتھی کے گلے میں باندھ کر اُسے کھُلا چھوڑ دیا۔ ہاتھی جِس طرح ہر روز قلعے کی ڈیوڑھی پہ حاضر ہوتا تھا۔ اب بھی سیدھا وہیں جا پہنچا۔

لوگوں نے جو یہ نیا تماشہ دیکھا کہ ہاتھی چھاج سے کان ہلاتا ہے اور ڈھولک خود بخود بجنے لگتی ہے تو اُس کے ارد گرد بھیڑ لگ گئی۔

تھوڑی دیر میں یہ غُل غپاڑہ سُن کر مہاراجے نے بھی کھڑکی سے سر نکالا اور ہاتھی کو پہچانتے ہی میراثی کو بُلا کر پوچھا۔ "تُم نے یہ کیا سوانگ بنا رکھا ہے۔"

میراثی نے عرض کی۔ "مہاراج! حضور جانتے ہیں، ہم غریب اپنا پیٹ تو پال نہیں سکتے، بھلا ہاتھی کا پیٹ کہاں سے بھریں گے؟ اِس لیے جو ہُنر

خود جانتے تھے وہی اِسے بتا دیا ہے۔ کہ ڈھولک بجاتا اور مانگتا کھاتا پھرے۔"

یہ سُن کر مہاراج ہنس پڑے۔ ہاتھی کو فیل خانے بھجوا دیا اور میراثی کو خزانے سے اُس کی قیمت دِلوا دی۔

نیّت کا پھل

پانی یوں تو سب جگہ بڑی چیز ہے مگر ریتلے گرم اور خُشک علاقوں میں تو خُدا کی بڑی ہی نِعمت سمجھا جاتا ہے کہ وہاں نہ دریا ہیں نہ کنوئیں نہ نہریں۔ بس جہاں کہیں تالابوں، جوہڑوں میں مینہ کا پانی جمع ہو جاتا ہے، سب اُسی کو دُور دُور بھر کر لے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں، ایک ریتلے علاقے کے رہنے والے کو اپنے بادشاہ کی سخاوت کے

قصّے سُن کر خیال آیا کہ میں بھی کوئی چیز بادشاہ تک لے جاؤں تو اُمّید ہے کہ اُس کی سخاوت سے خاصی دولت لے آؤں گا۔

آخر اُس نے سوچا کہ پانی ہی سب سے اچھّی چیز ہے۔ اُسی کا ایک گھڑا بادشاہ کے حضور تحفے کے طور پر لے جانا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے پانی کا گھڑا بھر کر اُٹھا لیا اور بہت دِن سفر کر کے اُس شہر میں جا پہنچا، جہاں بادشاہ رہتا تھا۔

یہ شہر دریا کے کنارے آباد تھا اور اتّفاق سے جس وقت گنوار گھڑا لے کر وہاں پہنچا بادشاہ دریا کی سیر کے لیے ایک کشتی میں بیٹھنے کو تیّار تھا۔

گنوار بھی جلدی سے کشتی تک جا پہنچا۔ لیکن دریا کو موجیں مارتے اور ہزاروں آدمیوں کو اُس میں تیرتے دیکھ کر نہایت شرمندہ ہوا کہ میں ایسے بادشاہ کے لیے ایسی بے حقیقت چیز کیوں لے آیا۔

بادشاہ نے اجنبی گنوار کو کشتی تک آتے اور پھر حیران ہو کر کھڑا رہ جاتے دیکھ لیا تھا۔ اُس لیے مہربانی سے پاس بُلا کر پوچھا۔ " تُم کِسے ڈھونڈتے اور کیا چاہتے ہو۔"

گنوار نے عرض کی۔ "بادشاہ سلامت! میں حضور کے لیے یہ پانی کا گھڑا مہینہ بھر کی راہ سے اُٹھا کر لایا ہوں۔ مگر یہاں آکر دیکھا تو یہ کُچھ چیز ہی نہیں۔"

یہ سُن کر بادشاہ نے خزانچی کو حکم دیا کہ پانی دریا میں پھینکوا کر اِس کا گھڑا روپوں سے بھر دو کہ قدر دان انسان مالیت کو نہیں بلکہ نیّت کو دیکھتے ہیں۔

محمود اور ایاز
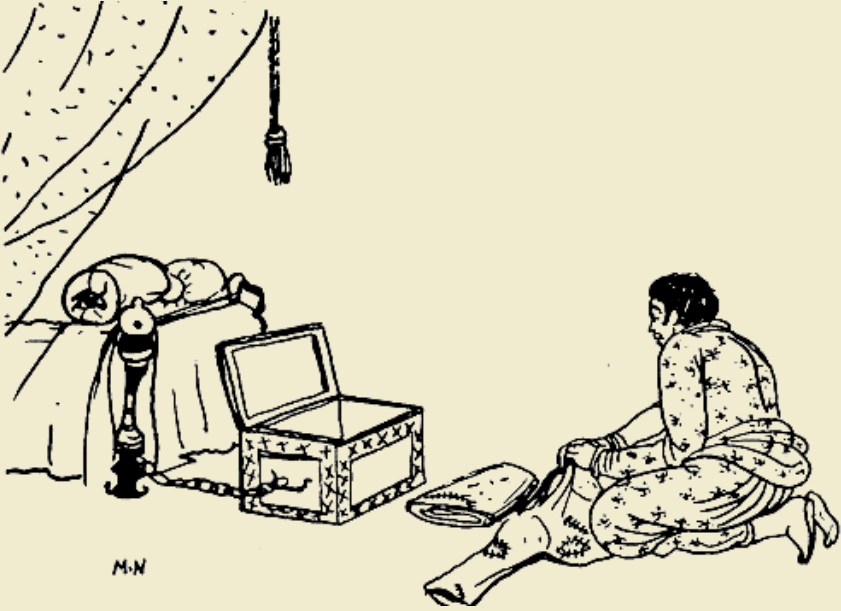
ایاز سلطان محمود اپنے نوکروں میں سے ایاز پر بڑا مہربان تھا۔ اس لیے تمام نوکر اِسی فکر میں رہتے تھے کہ اُس کی کوئی شکایت کر کے سُلطان کا دِل کھٹّا کر دیں۔

آخر بہت تلاش کے بعد اُنہیں معلوم ہوا کہ ایاز جس پلنگ پر سویا کرتا

ہے۔ اُس کے سرہانے چاندی کا ایک صندُوق رکھّا ہے، جس کی زنجیر اُس نے اپنے پلنگ کے پائے سے باندھ رکھتی ہے اور ہر روز اُٹھتے وقت اُسے کھول کر ضرور دیکھ لیتا ہے۔"

اِس سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ضرور اس صندُوق میں بڑے بڑے بیش قیمت جواہرات ہوں گے۔

ایک دِن موقع پاکر اُنہوں نے سلطان سے عرض کی:

"حضور! ایاز کے پاس جواہرات کا ایک ایسا صندُوق ہے، جس کی زنجیر اُس کے پلنگ کے پائے سے بندھی رہتی ہے۔ روز صُبح جب تک انہیں دیکھ نہ لے، باہر نہیں نکلتا۔ حضور بھی دیکھیں گے تو پسند فرمائیں گے۔"

سلطان نے ایاز کو بُلا کر صندُوق کا حال پوچھا تو اُس نے اُسی وقت دربار میں صندُوق منگا کر کُنجی بادشاہ کے حوالے کر دی کہ " حضور اپنے ہاتھ

سے کھول کر دیکھ لیں۔"

سلطان نے شوق سے صندُوق تو کھول لیا مگر دیکھتا کیا ہے کہ اس میں صرف دو ایک پھٹے پُرانے اور میلے کچیلے کپڑے رکھے ہیں جنہیں دیکھ کر اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "ایاز یہ کیا بات ہے؟"

ایاز نے کہا۔ "بادشاہ سلامت! یہ وہ کپڑے ہیں جنہیں میں حضور کے ہاں پہنچنے سے پہلے پہنا کرتا تھا اور ہر روز اس لیے دیکھ لیتا ہوں کہ امیری کی بُو میں اپنی پہلی حالت نہ بھُول جاؤں اور اِس دولت پر جو اَب حضور کے طُفیل میسّر ہے، مغرور نہ ہو جاؤں۔"

ایاز کے اِس جواب سے سلطان نہایت خوش ہوا اور چغلی کھانے والے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

بُردباری

ایک نیک بادشاہ رات کو بھیس بدل کر پھرا کرتا تھا کہ لوگوں کا اصلی حال دیکھ کر جہاں تک ہو سکے، ان کی تکلیفیں دور کر دیا کرے۔

جاڑے کے موسم میں وہ ایک رات شہر کے باہر کسی ویران مکان کے پاس سے جا رہا تھا کہ دو آدمیوں کے بولنے کی آواز آئی۔ کان لگا کر سُنا تو

ایک آدمی کہہ رہا تھا۔ ”لوگ بادشاہ کو خُدا ترس تو کہتے ہیں، مگر یہ کہاں کی خُدا ترسی ہے کہ وہ تو اپنے محلوں میں نرم اور گرم بستروں پر سوئے اور مسافر جنگل کی اِن برفانی ہواؤں میں مریں۔ خُدا کی قسم، اگر قیامت کے دِن وہ بہشت میں بھیجا گیا تو میں کبھی نہ جانے دوں گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”حکومت میں خُدا ترسی کہاں؟ یہ خوشامدیوں کی باتیں ہیں۔“

یہ سُن کر نیک بادشاہ واپس چلا آیا اور محل میں پہنچ کر حکم دیا کہ دو غریب مسافر شہر کے باہر فلاں جگہ پڑے ہوئے ہیں، اُنہیں اِسی وقت لے آؤ اور کھانا کھلا کر آرام سے سُلا دو۔“ چنانچہ فوراً حکم کی تعمیل ہو گئی۔

صُبح جب دِن چڑھا تو بادشاہ نے بُلا کر مسافروں سے کہا۔ ”بھائیو! شہر کے باہر تمہیں تکلیف تو ضرور ہوئی، مگر یہ تمہارا اپنا قصور تھا کہ نو بجے رات

تک بھی شہر میں نہ آئے اور دروازہ بند ہو گیا۔ پھر بھی میں نے آج شہر کے باہر ایک سرائے بنانے کا حکم دے کر تم سے صُلح کر لی ہے۔ اُمّید ہے تُم بھی اب قیامت کے دِن مُجھ سے دُشمنی نہ رکھو گے۔"

مسافروں نے شرمندگی سے سر نیچا کر لیا اور بادشاہ کی نیکی کے گیت گاتے ہوئے گھروں کو چلے گئے۔

بے غرض نیکی

ایک نیک عورت کہیں گاڑی میں سوار جارہی تھی کہ اسے سڑک پر چھوٹی عمر کا ایک لڑکا نظر آیا، جو ننگے پاؤں چلا جارہا تھا اور بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر نیک عورت نے کوچوان سے کہا ”غریب لڑکے کو گاڑی میں بٹھالو۔ اِس کا کرایہ میں ادا کردوں گی۔“

اِس کے بیس سال بعد اِسی سڑک پر ایک کپتان گاڑی پر سوار چلا جاتا تھا۔ اُس کی نظر اِتّفاقاً ایک بوڑھی عورت پر جا پڑی، جو تھکی ہوئی چال سے پیدل چل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر کپتان نے کوچوان کو حکم دیا۔ گاڑی ٹھہرا کر اِس بوڑھی عورت کو بھی بٹھالو۔ اِس کا کرایہ میں ادا کر دوں گا۔"

منزل پر سواریاں گاڑی سے اُترنے لگیں تو بُوڑھی عورت نے کپتان کا شکریہ ادا کر کے کہا۔ "اِس وقت میرے پاس کرایہ ادا کرنے کے لیے دام نہیں۔"

کپتان نے جواب دیا: "تُم بالکل فکر نہ کرو۔ میں نے کرایہ دے دیا ہے۔ کیونکہ مُجھے بوڑھی عورتوں کو پیدل چلتے دیکھ کر ہمیشہ ترس آجاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بیس سال ہوئے جب میں غریب لڑکا تھا۔ مُجھے اِسی جگہ کے آس پاس سڑک پر ننگے پاؤں پیدل چلتے دیکھ کر ایک رحم دل عورت نے

گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔ "بوڑھی عورت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کپتان صاحب! وہ عورت یہی کم بخت بُڑھیا ہے، جو تمہارے سامنے کھڑی ہے اور جس کی حالت اب اتنی بگڑ گئی ہے کہ وہ اپنا کرایہ بھی نہیں دے سکتی۔"

کپتان نے کہا۔ "نیک بخت امّاں! اب آپ اِس کا کوئی غم نہ کریں۔ میں نے بہت روپیہ کما لیا ہے اور زندگی کے باقی دِن آرام سے کاٹنے کے لیے وطن آرہا ہوں۔ تُم جب تک زندہ رہو گی میں بڑی خوشی سے تمہاری خدمت کروں گا۔"

یہ سُن کر بوڑھی عورت شکریہ ادا کرتی ہوئی رو پڑی اور کپتان کو دُعائیں دینے لگی۔

کپتان تمام عُمر اُس کی مدد کرتا رہا۔

دولت اور علم

ایک شہر میں دو دولت مندوں کے بیٹے آپس میں گہرے یار تھے۔ دونوں کی ایک ہی زمانے میں شادیاں ہوئیں اور دو ہی سال میں ایک کے ہاں لڑکا ہوا۔ دوسرے کے ہاں لڑکی۔ دونوں نے اقرار کیا کہ جوان ہونے پر اِن دونوں بچّوں کا آپس میں بیاہ کر دیں گے۔

لڑکی والے نے لڑکی کو محبّت سے پالا۔ جہاں کوئی اچھّا گہنا کپڑا پایا اور کوئی

اچھّی چیز دیکھتا، ضرور لے آتا۔

لڑکے والا اپنا روپیہ لڑکے کی خوراک، ورزش اور لکھنے پڑھنے پر خرچ کرتا۔ مگر ظاہری چاؤ چونچلے کے پاس نہ پھٹکتا۔

آخر جب لڑکے نے بی اے پاس کر لیا تو بیاہ کی تیّاری ہوئی۔ مگر اُن کے پاس نہ کُچھ زیادہ سامان تھا نہ روپیہ، صرف معمولی زیور کپڑا ہی بن سکا۔ اِدھر لڑکی والے نے اِس ٹھاٹ باٹ کا جہیز دیا کہ واہ واہ کی دُھوم مچ گئی۔

بیاہ کے دوسرے سال بی اے نوجوان کہیں پہاڑ پر گیا ہوا تھا کہ گھر کو آگ لگ گئی اور بیوی جہیز کا ہزاروں کا سامان گھڑی بھر میں جل جلا کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ بلکہ ساتھ ہی میاں کا کُتب خانہ بھی خاک سیاہ ہو گیا۔

اُس مُصیبت کی خبر لڑکی کے والدین کو پہنچی تو اُن بے چاروں نے مارے

رنج و غم کے منہ نوچ لیا اور بالآخر اِسی غم میں جان بھی گنوا دی۔

اِدھر بی اے نوجوان جنگی بیڑے میں نام لکھوا کر پانچ سو روپے ماہوار کے عہدے پر بصرے چلا گیا اور تین برس کے بعد دس ہزار روپے لے کر پلٹا۔ مکان کی مرمّت بھی کرا لی گئی اور کُل سامان بھی پہلے سے بڑھ چڑھ کر تیّار ہو گیا۔

اُستاد کی مار

ایک دِن مامون رشید کی والدہ نے اُس کے استاد سے کہلا بھیجا۔ ”شہزادہ گھر میں شوخی کرتا ہے۔ اِسے سزا دینی چاہیئے۔“

اُستاد نے شہزادے نے مُنہ پر دو چار طمانچے لگا کر کان پکڑوا دیے، جس سے مامون کو اِتنی تکلیف ہوئی کہ بے اختیّار آنسو جاری ہو گئے۔

یہ کان پکڑے ہوئے رو رہا تھا کہ کسی چوب دار نے آ کر اُستاد سے کہا۔

”جعفر برمکی وزیرِ سلطنت شہزادے کو دیکھنے کی اجازت چاہتا ہے۔“

اُستاد نے شہزادے سے کہا: ”کان چھوڑ ذرا سنبھل بیٹھو۔“

شہزادے کا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا سُرخی سے تمتما رہا تھا۔ مگر وہ جھَٹ رومال سے مُنہ پونچھ کر بدستور اپنی جگہ بیٹھ گیا اور وزیر کے جانے تک برابر اِس طرح بیٹھا رہا کہ اُسے اُس کی کسی حرکت سے سزا کا خیال تک نہ گزرا۔

وزیر کے جانے پر اُستاد نے شہزادے سے کہا۔” اگرچہ مُجھ سے یہ حرکت تمہاری ہی بھلائی کے لیے ہوئی تھی مگر تُم نے اچھّا کیا کہ وزیر سے شکایت نہ کی۔“

شہزادے نے کہا۔”جناب! جو لڑکا اُستاد کی شکایت کرتا ہے، وہ مُراد کو

نہیں پہنچ سکتا۔ میں آپ کی شکایت کر کے خود کیوں بے نصیب بنتا۔“

کُچھ دے دیں گے

ایک مسافر نے کسی شہر کی سرائے میں اُتر کر سرائے والے سے کہا۔

"کوئی نائی بلوا دو تو میں خط بنوا لوں۔"

سرائے والے نے ایک نائی کو بُلایا۔ نائی نے حجامت بنانے سے پہلے مسافر سے پوچھا۔ "حضور! مزدوری کیا ملے گی؟"

مسافر نے کہا۔ ”ارے پوچھتا کیا ہے۔ کُچھ دے دیں گے۔“

اِس پر نائی نے خط بنا دیا اور مسافر نے دو آنے نکال حوالے کیے مگر نائی نے کہا۔ ”حضور! کُچھ، دینے کا اقرار ہوا ہے۔ اب زبان نہ بدلیے۔ میں تو کُچھ ہی لوں گا۔“

مسافر نے اور دو آنے پھینک دیے۔ لیکن نائی نے کہا۔ ”میں تو روپیہ لوں نہ دو روپے کُچھ ہی لوں گا تو پِنڈ چھوڑوں گا۔“

سب کے سب لوگ نائی کی اِس حُجّت سے تنگ آ گئے۔ مگر اُس کی بات پوری کرنے کی تجویز کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اتنے میں سکول بند ہونے پر سرائے والے کا لڑکا بھی گھر واپس آیا۔ لڑکا تھوڑی دیر تو لوگوں کی باتیں سُنتا رہا۔ پھر چُپکے سے جا کر ایک چنگیر میں ایک طرف روٹی کا ٹکڑا، دوسری طرف دو پیسے، تیسری طرف ایک

پوسٹ کارڈ اور چوتھی طرف ایک کیلا رکھ کر مسافر کے پاس لے آیا اور کہا: ”آپ گھبرائیں نہیں۔ میں اِس چنگیر میں بہت کُچھ رکھ لایا ہوں۔ نائی سے کہہ دیجیے اس میں سے جو کُچھ وہ چاہے، اُٹھالے۔“

مُسافر بہت خوش ہوا اور نائی سے کہا تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

یہ دیکھ کر لوگ لڑکے کی دانائی پر دنگ رہ گئے۔ مسافر نے لڑکے کو شاباش اور انعام دے کر پوچھا۔ ”بیٹا! یہ تو بتاؤ کہ تمہیں یہ بات سُوجھ کہاں سے گئی۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”جناب! یہ سب عِلم ہی کی برکت ہے۔ میں نے ایک دفعہ کسی کتاب میں ایسا ہی قصّہ پڑھا تھا وہ یاد آ گیا۔“

کام سے نہ ڈرو

ایک سوداگر کسی سفر میں جہاز پر سوار ہوا تو باتوں باتوں میں کپتان سے پوچھا۔ ”آپ کے والد کیا کام کرتے تھے؟“

اُس نے کہا: ”مہربان! باپ پر کیا موقوف ہے۔ ہماری سات پیڑھیاں جہاز رانی ہی کرتے گُزر گئی ہیں۔“

سوداگر نے پوچھا۔ ”آپ کے باپ کی قبر کہاں ہے؟“

کپتان نے کہا۔ ”دو سال ہوئے وہ امپریس جہاز کو ہسپانیہ لے جا رہے تھے۔ راستے میں طوفان نے آلیا۔ اُنہوں نے سواریوں کو تو کشتیوں پر سوار کرا کے بچا دیا۔ مگر آپ بے چارے جہاز سمیت سمندر میں ڈوب گئے۔“

سوداگر نے افسوس کر کے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔ ”آپ کے دادا کیونکر فوت ہوئے تھے؟“

کپتان نے کہا۔ ”اِسی طرح ایک جہاز کے ڈوب جانے سے۔“

سوداگر نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اِس خطرناک کام میں جب آپ کے باپ دادا گئے تو تعجّب ہے کہ آپ نے اِسے کیوں اختیار کیا؟“

کپتان نے پھر تھوڑی دیر اور باتیں کر کے سوداگر سے پوچھا۔ ”آپ کے

والد صاحب کِس دُکان پر بیٹھتے تھے۔"

سوداگر نے کہا۔"اُسی دکان پر، جہاں میں بیٹھتا ہوں۔"

پھر پوچھا۔"دادا؟"

سوداگر نے کہا۔"وہ بھی اُسی دُکان پر تھے۔"

کپتان نے کہا:"اچھّا آپ کے باپ دادا مرے کس مکان میں تھے؟"

سوداگر نے کہا۔"اُسی مکان میں، جس میں ہم رہتے ہیں۔"

کپتان نے کہا۔"کتنا تعجّب ہے۔ جِس دکان اور مکان میں آپ کے باپ دادا مرے آپ بھی اُسی میں رہتے اور وہیں کاروبار کرتے ہیں۔"

علم کی طاقت

کولمبس جس نے امریکہ دریافت کیا تھا ایک جہاز ران کا بیٹا تھا۔ ایسے لوگوں کو ستاروں کی چال بخوبی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اِسی علم پر جہاز رانی موقوف ہے۔

ایک دِن کولمبس کو خیال آیا کہ سمندر کا دوسرا کنارہ بھی دیکھنا چاہیئے۔ کیا عجب کہ اُدھر بھی کوئی مُلک آباد ہو۔ چنانچہ شاہی دربار کی امداد سے دو جہاز لے کر بحری سفر پر روانہ ہوا اور ستاروں کی رہ نمائی سے امریکہ تک جا پہنچا۔

اِس وقت تو امریکہ علم اور دولت کی کان بنا ہوا ہے۔ مگر اُس وقت وہاں جتنے بھی جنگلی لوگ رہتے تھے، بالکل وحشی اور طرح طرح کے وہموں میں پھنسے ہوئے تھے۔ کولمبس نے اُن پر حکومت جمانی چاہی تو اُنہوں نے مقابلہ کیا۔ کولمبس کے ساتھی تعداد میں کم تھے اور لڑائی میں پورے نہ اُتر سکتے تھے۔

آخر سوچتے سوچتے اُسے یاد آ گیا کہ کل سورج گرہن ہو گا۔ اِس خیال کے آتے ہی اُس نے وحشیوں کے سردار کو بُلا کر کہا۔ ”دیکھو! اگر تُم ہماری فرماں برداری نہ کرو گے تو میں سورج کو حکم دوں گا اور وہ تمہیں

جلا کر خاک سیاہ کر دے گا۔“

اُس وقت تو وحشی چُپکے سُنتے رہے مگر دوسرے دِن جب سُورج کو گہن لگنا شروع ہوا تو سخت گھبرائے۔ غرض کولمبس کو جادُوگر اور کراماتی بزرگ سمجھ کر اُس کے پاس حاضر ہو گئے اور اِطاعت قبول کر لی۔

علم میں کتنی طاقت ہے کہ جو کام بہت بڑی فوج نہ کر سکتی تھی، وہ علم کے ایک نکتے نے ذرا سی دیر میں کر دیا۔

گُفتگُو کا سلیقہ

ایک دفعہ ہارون رشید نے خواب میں دیکھا کہ میرے بہت سے دانت ٹوٹ کر گِر پڑے ہیں۔

صُبح ہوئی تو عالموں کو بُلا کر خواب کی تعبیر پوچھی۔ ایک شخص نے کہا۔ ”آپ کے اکثر عزیز آپ کے سامنے مر جائیں گے۔“

یہ بات ہارون رشید کو اتنی ناگوار گزری کہ اُس شخص کو اُسی وقت دربار سے نکلوادیا۔

پھر دوسروں سے پوچھا اور جواب سے ناخوش ہو کر یہی سَلُوک کیا۔ آخر ایک موقع شناس درباری نے عرض کی۔ ”جہاں پناہ! حضور کا خواب بہت مبارک ہے۔ جس کی تعبیر یہ ہے کہ خُدا حضور کو ایسی لمبی عُمر عطا فرمائے گا کہ حضور کے جیتے جی شاہی خاندان میں شادی اور کی اکثر رسمیں انجام پائیں گی۔“

دانا کے اِس جواب سے ہارون رشید خُوش ہو گیا اور انعام وخِلعت دے کر ارشاد فرمایا۔ ”میں خوب سمجھتا ہوں کہ مطلب سب ایک ہی ہے مگر بیان کرنے کا ڈھنگ جُدا جُدا ہے۔ آخری درباری کو گُفتگُو کا سلیقہ ہے جو پہلوں میں نہیں۔ اِسی لیے اُن کے ساتھ یہ بد سلُوکی کی گئی ہے۔“

کچّے سُوت کی انٹی

ایک شخص کے بیٹے ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ایک دِن باپ نے سب کو پاس بُلایا اور کچّے سُوت کی ایک انٹی دے کر فرمایا۔ ''تُم سب شہ زور نوجوان ہو۔ آج تمہاری طاقت کا امتحان ہے۔ اگر تُم میں سے کوئی اِس انٹی کو ایک دو جھٹکوں میں توڑ دے تو ہم پانچ روپے اِنعام دیں

گے۔"

اِس کے سُنتے ہی باری باری سب نے زور لگایا مگر انٹی نہ ٹوٹ سکی۔ جب سب عاجز آ گئے تو باپ نے کہا۔ تار الگ الگ کر لو گے تو ٹوٹ جائے گی۔ انٹی تو جھٹکوں میں پہلے ہی بودی ہو رہی تھی۔ تاروں کے کھُلتے ہی پُرزے پُرزے ہونے لگی۔

باپ نے پُوچھا۔ "بھلا بتاؤ تو یہ اب کیوں ٹوٹ رہی ہے۔"

لڑکوں نے کہا۔ "اِس لیے کہ جب تک سب دھاگے اکٹھے تھے زور کارگر نہ ہوتا تھا اور اب ہر دھاگا جُدا ہو چکا ہے۔ اُنگلی کا اشارہ بھی کافی ہے۔"

باپ نے کہا۔ "یہی حال اتّفاق اور نااتّفاقی کا سمجھ لو۔ اگر تُم آپس میں مل جُل کر رہو گے تو دُشمنوں کے نقصان پہنچانے سے بچے رہو گے اور اگر

خود سر ہو کر الگ الگ ہو جاؤ گے تو دُنیا کی مُصیبتوں کا چھوٹا سا جھٹکا بھی تمہارے ٹکڑے اُڑا دے گا۔"

باپ کی یہ نصیحت لڑکوں پر اتنی کار گر ہوئی کہ وہ لڑنا جھگڑنا چھوڑ کر اتّفاق اور محبّت سے رہنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دِنوں میں محلّے کے ہمسائے بھی تعریفیں کرنے لگے اور اتّفاق کی برکت سے کاروبار میں بھی دِن دونی اور رات چوگُنی ترقّی ہو گئی۔

بُڑھیا کا جھونپڑا

کہتے ہیں نوشیر واں نے شاہی محل بنوانا چاہا تو اُس کے چوکور بنانے کے لیے ایک طرف کسی قدر زمین کی ضرورت تھی جس پر ایک غریب بُڑھیا کا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔

سرکاری ملازموں نے بُڑھیا سے زمین خریدنی چاہی تو اُس نے بیچنے سے انکار کر دیا۔ نوشیر واں نے سُنا تو فرمایا:

”محل چوکور نہ بنے تو بلا سے، مگر بُڑھیا پر جبر نہ ہو۔“ شاہی محل ایک طرف سے ٹیڑھا بن گیا۔

محل بن چُکا تو بُڑھیا نے حاضر ہو کر عرض کی۔ ”جہاں پناہ! سچ مُچ شاہی محل اِس جھونپڑے کی زمین لیے بغیر ٹیڑھا تِرچھا اچھّا نہیں معلوم ہو تا۔ لیجیے یہ زمین بے قیمت حاضر ہے۔“

نوشیر واں نے پوچھا۔ ”تُم نے پہلے کیوں انکار کر دیا تھا؟“

بڑھیا نے جواب دیا۔ ”صِرف اِس لیے کہ دُنیا بھر میں آپ کے انصاف کا ڈنکا بج جائے۔“

اِس پر نوشیر واں نے بُڑھیا کو تو انعام و اکرام دے کر رُخصت کر دیا۔ مگر اُس کی زمین نہ لی اور محل کو بدستور ٹیڑھا رہنے دیا۔

نوشیر واں اور بُڑھیا تو دونوں چل بسے مگر انصاف کی یہ کہانی اب تک

لوگوں کو نوکِ زبان یاد ہے اور ہر ایک سے اُس مُنصِف بادشاہ کی تعریفیں کرا رہی ہے۔

اِسی طرح اگر ہر شخص اپنے ہر کام میں اِنصاف اور مروّت سے کام لیا کرے تو اُس سے خُدا بھی خوش ہو جائے۔ اور مخلُوق بھی۔

اُمّید کا پھل

ایک شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک بُوڑھا نیا باغ لگا رہا ہے۔ شہزادے نے اُس سے پوچھا۔ ”بڑے میاں! تُم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو۔ پھر باغ لگانے کی زحمت کیوں اُٹھاتے ہو۔“

بُوڑھے نے جواب دیا۔ ”جنابِ عالی! اوّل تو مَوت کا کوئی وقت نہیں۔ آئے تو ابھی آجائے اور نہ آئے تو دس بیس برس بھی نہ آئے۔ باغ

میرے سامنے پھل لے آیا تو میں بھی اِس کی بہار دیکھ لُوں گا اور اگر میں پہلے مَر گیا تو جس طرح دوسروں کے لگائے ہوئے درختوں کے پھل ہم کھا رہے ہیں ہمارے لگائے ہوئے درختوں کے دوسرے کھالیں گے۔"

شہزادے نے کہا۔ "اِتنی لمبی اُمّید عقل کے خلاف ہے۔ خیر اگر تمہارے جیتے جی یہ پیڑ پھل دے گئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اِس باغ کا مالیہ معاف کرادُوں گا۔"

چند سال گزرے کہ بادشاہ فوت ہو گیا۔ اور وہی شہزادہ تخت نشین ہوا تو اُس نے مُلک کا دورہ شروع کیا۔ اتّفاق سے اُسی باغ کی طرف آ نکلا۔ بُوڑھے نے سلام اور دُعا کے بعد اُس سے عرض کی:

"حضور! جب میں باغ لگا رہا تھا، ایک بہت بڑے شہزادے نے میری ضعیفی دیکھ کر وعدہ فرمایا تھا کہ اگر تمہاری عمر میں یہ باغ پھل دے گیا تو

ہم مالیہ مُعاف کرا دیں گے۔ اب باغ دو سال سے پھل دے رہا ہے۔ حضُور بادشاہ ہیں۔ اگر شہزادوں کو یہ پیغام پہنچا دیں تو مُمکن ہے، میرا کام ہو جائے۔"

یہ بات سُن کر بادشاہ کو سارا واقعہ یاد آ گیا اور اُسی وقت معافی کا فرمان عطا فرما کر کہا۔ "باہمّت بوڑھے! خوش ہو۔ میں ہی وہ شخص ہوں، جِس نے تُم سے یہ وعدہ کیا تھا اور اب تمہاری ہمّت کا پھل دینے کو خود موجود ہو گیا ہوں۔"

صبر اور دیانتداری

ایک دفعہ قحط کے زمانے میں کسی قصبے کا رئیس ہر روز صُبح کو سَو دو سَو روٹیاں پکوا کر سامنے رکھ لیا کرتا۔ گاؤں کے بچّے جمع ہو جاتے اور اپنے ہاتھ سے ایک ایک روٹی اُٹھا کر چل دیتے۔ اُن میں سے اکثر لڑکے اتنی جلدی کرتے کہ کسی کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیتے اور کسی کے مونڈھے پر

سوار ہو کر آگے بڑھ جاتے مگر ایک چھوٹی لڑکی خاموش کھڑی رہتی۔
جب سب لڑکے روٹی لے چُکتے تو اُس بے چاری کے حصّے میں وہ روٹی آتی
جو سب سے چھوٹی ہوتی۔

امیر دو دِن لڑکی کی اِس شرم و حیا کو دیکھتا رہا۔ تیسرے دِن بھی وہی کُچھ
ہوا۔ لڑکے بڑی روٹیاں لے گئے اور چھوٹی روٹی اُس شرمیلی لڑکی کے
لیے رہ گئی۔

مگر اُس روز جب لڑکی نے روٹی گھر جا کر ماں کے حوالے کی اور اُس نے
لڑکی کو آدھی روٹی دینے کے لیے اُس کا ٹکڑا توڑا تو اُس میں سے دو رُوپے
نکل آئے۔

لڑکی کی ماں نے دیکھتے ہی دونوں کے دونوں رُوپے لڑکی کو دے کر رئیس
کے پاس بھیج دیا کہ غَلَطی سے آٹے میں گِر کر مِل گئے ہوں گے۔ آپ

اپنے رُوپے لے لیجئے۔

رئیس لڑکی کے صبر پر تو پہلے ہی خُوش ہو رہا تھا۔ اب اُس کی ماں کی دیانت داری سے اور بھی خوش ہو کر بولا۔ ”بیٹی! یہ دو روپے کل میں نے تمہارے صبر سے خوش ہو کر خود چھوٹی روٹی میں رکھوا دیے تھے۔ تُم اِن کے کپڑے بنوا لینا اور یہ تین رُوپے لے جاؤ۔ یہ اپنی ماں کو دے دیا کہ یہ اُس کی دِیانتداری کا اِنعام ہے۔“

کام بڑا کہ نام

ایک رات کسی بڑے طاقت ور چور نے رُستم کے اصطبل سے اُس کا گھوڑا لیا۔ اگرچہ رُستم اُس وقت جاگ رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میرے مُنہ زور گھوڑے پر کوئی سوار نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے چُپ کا تماشا دیکھتا رہا۔ لیکن جب چور سوار ہو کر اُسے باہر لے گیا تو رُستم خاموش نہ رہ سکا۔ گھر سے نکل کر وہ دوڑ لگائی کہ چور کے سر پر جا پہنچا اور چھلانگ لگا کر گھوڑے کی

سوار ہو گیا۔

رُستم بیٹھ تو گیا مگر بہادر چُور نہ کُچھ ڈرا نہ گھبرایا بلکہ بے تکلّفی سے پُوچھنے لگا۔ "تُم کون ہو؟"

رُستم نے کہا۔ "پہلے تُم بتاؤ۔"

چُور بولا۔ "میں تو چور ہوں۔"

رُستم نے کہا۔ "مجُھے بھی وہی سمجھ لو۔"

رُستم نے چور کو اِتنا نڈر دیکھا تو چُپکے سے اُسے پانچ سات زور کے مُکّے لگا دیے۔ مگر چور اُنہیں بھی کُچھ نہ سمجھا اور کہا بھی تو یہ کہ "ارے میاں! یہ کیا مسخرہ پن ہے۔ آرام کے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتے۔"

چور کی زبان سے یہ فقرہ سُن کر رُستم کے اور بھی اوسان خطا ہو گئے کہ جو میرے گھونسوں کو مسخرہ پَن بتاتا ہے وہ کُشتی سے کب زیر ہو گا۔ بس

یہاں کُچھ اور ہی داؤ کھیلنا چاہیئے۔ یہ سوچ کر رُستم نے گھبر ائی ہوئی آواز سے کہا۔ ”لو دوست! میں تو چلا! وہ دیکھو گھوڑے کا مالک۔ رُستم آ رہا ہے۔“

یہ سُنتے ہی چور فوراً کُود پڑا اور رُستم گھوڑا لے کر گھر پہنچ گیا۔ واقعی بعض دفعہ نام بھی بڑا کام دے جاتا ہے۔ مگر نام بھی کام کے بغیر نہیں بنتا۔

بارہ پیٹھے تیرہ لاگی

ایک زمیندار کسی راجے کے یہاں نذرانے کو بارہ پیٹھے لے گیا۔ وُہ شہر کے دروازے پہنچا تو ایک پیٹھا چُنگی والے نے رکھوا کیا کہ ہمارا حق دیتے جاؤ۔ دوسرا پولیس کے سپاہی نے ہتھیا لیا جو دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ تیسرا سارجنٹ نے اُڑا لیا اور چوتھا کوتوال صاحب کی نذر ہو گیا جو اُس

وقت گشت کے لیے آ نکلے تھے۔

غریب باقی آٹھ پیٹھے لے کر راجے کے دربار کو روانہ ہوا تو اُسے اتنے خدمتگار، چوب دار، چپراسی، اردلی وغیرہ لِپٹ گئے کہ جان چھڑائی مشکل ہو گئی۔ مُختصر یہ کہ راجا صاحب کو اطلاع ہونے تک بارہ پیٹھے تو یوُنہی بَٹ گئے، بلکہ ایک چپراسی نے اپنے حِصّے کے دعوے میں وہ رسّی کا جال اُٹھالیا، جس میں پیٹے بندھے ہوئے تھے۔

یہ چھینا جھپٹی ہو ہی رہی تھی کہ راجا صاحب بھی کسی ضرورت کے لیے باہر آ نکلے اور اردلی وغیرہ نوکروں کو زمیندار کے ساتھ لپٹا ہوا دیکھ کر پوچھا۔ "ایں! یہ شور کیسا ہے؟"

کسان نے عرض کی۔ "غریب پرور! بارہ پیٹھے اور تیرہ لاگی کا معاملہ ہے۔

راجے نے اِس عجیب معمّے کی تفصیل سُنی تو اُن تمام لوگوں کو موقوف کر

دیا جنہوں نے زمیندار سے رشوت لی تھی اور زمیندار کو کُچھ انعام دے کر آئندہ کے لیے حکم دے دیا کہ اگر کوئی اہلکار کسی رشوت لے گا تو سخت سزا پائے گا۔

عالِم کی عُمر

کسی نے ایک بڑے تاریخ دان سے پوچھا۔ ”آپ کی عُمر کتنی ہو گی؟“

تاریخ دان نے کہا۔ ”یہی کوئی سات آٹھ ہزار سال کی۔“

اُس نے کہا: ”صورت سے تو آپ چالیس برس کے معلوم ہوتے ہیں۔“

تاریخ دان نے جواب دیا۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے کہ مجُھے اِس دُنیا

میں آئے ہوئے چالیس سال ہی گُزرے ہیں لیکن عِلم نے میری عُمر کو اتنا بڑھا دیا کہ آج سے سات آٹھ ہزار برس پہلے کی باتیں مُجھے ایسی معلوم ہوتی ہیں، گویا میرے سامنے ہو رہی ہیں۔ وہ تمام بڑے بڑے شاہی دربار جنہیں معمولی آدمی دیکھ نہ سکتے تھے اور ایسی سخت لڑائیاں جِن میں جاتے ہوئے بڑے بڑے بہادروں کے اوسان خطا ہوئے تھے، کِتاب کھولتے ہی میرے سامنے آجاتی ہیں۔ زبانیں میرے رُوبرُو بنتی اور بِگڑتی ہیں۔ مذہب میرے سامنے پیدا ہو کر دُور دُور پھیل جاتے ہیں۔ سلطنتیں میرے سامنے بن بن کر بگڑ جاتی ہیں۔ اور پرانی جگہیں نئے لوگ سنبھال لیتے ہیں۔ میں ہر زمانے کے مشہور آدمیوں کے ناموں اور اُن کے بھلے بُرے کاموں سے واقف ہوں۔ ہر مذہب کے عالِموں اور مُلک مُلک کے بادشاہوں کو جانتا ہوں۔ مُجھے معلوم ہے کہ جہاں اَب تُم شہر بستے، باغ مہکتے، ریل اور موٹر چلتے دیکھ رہے ہو، وہاں اِس سے پہلے اپنے

سُنسان جنگل تھے کہ آدمی قدم رکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔

مُلک، ریگستان، پہاڑ، دریا، بستیاں اور وِیرانے میرے دیکھتے دیکھتے کُچھ سے کُچھ ہوگئے۔ عِلم پڑھوگے تو ایسی ہی عُمر پالوگے۔

آدھا کمبل

ایک دولت مند سوداگر کی بیوی مر گئی تھی۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ خُود بھی دمے کے مرض میں مُبتلا ہو گیا تو اُس نے اپنی کُل جائداد اپنے جوان بیٹے کے نام کر دی۔

ہزاروں کی جائیداد پا کر پہلے پہلے تو نَوجوان لڑکا اور اُس کی بِیوی بچّے سب

سوداگر کی خاطِرداری کرتے رہے مگر برس چھ مہینے میں جوش ٹھنڈا ہو کر یہ حالت ہو گئی کہ علاج مُعالجہ بھی چھُوٹ گیا اور کھانا بھی وہی مِلنے لگا جو معمولی طَور پر گھر میں پکتا تھا۔ بلکہ ایک دِن تو نوجوان بیٹے نے صاف کہہ دیا کہ آپ اپنی چارپائی ڈیوڑھی میں بچھالیں تو بہتر ہو کہ ہر وقت کھانستے رہنے سے بچّوں میں بیماری پھَیلنے کا اندیشہ ہے۔"

بیمار باپ کو صبر و شُکر کے سِوا چارہ ہی کیا تھا۔ اُس نے کہا۔ مُجھے تو عُذر نہیں۔ مگر ایک کمبل اُوڑھنے کو چاہیئے کہ ابھی سردی باقی ہے۔"

نوجوان نے چھوٹے بیٹے سے کہا۔ "دادا کے لیے گائے والا کمبل تو اُٹھا لاؤ۔" لڑکا جھَٹ کمبل اُٹھا لایا اور دادا سے کہا۔ "لو دادا ! اِس میں سے آدھا تُم بھاڑ لو اور آدھا مُجھے دے دو۔"

دادا بولا۔ "بھلا آدھے کمبل سے سردی کیا جائے گی؟"

باپ نے بھی بیٹے سے کہا۔ ''دادا کو سارا ہی کمبل دے دو۔ جِس پر چھوٹے لڑکے نے بھولے پَن سے جواب دیا۔ گھر میں ایسا کمبل تو ایک ہی ہے۔ اگر سارا دادا کو دے دیا تو جب تُم بُوڑھے اور بیمار ہو کر ڈیوڑھی میں چارپائی بچھاؤ گے تو میں تمہیں کیا دُوں گا۔''

نوجوان باپ لڑکے کی یہ بھولی بات سُن کر سُن ہو گیا اور باپ سے معافی مانگ کر پوری اِطاعت اور خدمت کرنے لگا جس سے باپ بھی خوش ہو گیا اور عاقبت بھی سنور گئی۔

گیا وقت پھِر ہاتھ آتا نہیں

ایک کسان کا بیٹا کھیل کُود میں وقت کو بے فائدہ گنوایا کرتا تھا۔ باپ نے بہت سمجھایا مگر اُس نے اپنی عادت نہ بدلی۔ آخر باپ نے سوچ کر یہ ترکیب نکالی کہ بسنت کے دِن صُبح کے وقت بیٹے کو اپنے ساتھ لے گیا اور کہا۔ ”بیٹا! آج کے دِن جن سب سے اچھّی بالوں کے دانے ہم کھیت میں سے توڑ کر رکھ لیں گے اُس ایک دانے سے کئی کئی پودے ہو جائیں گے۔

مگر شرط یہ ہے کہ کھیت میں سے سیدھے نکلتے اور توڑتے چلے جاؤ۔ پیچھے مُڑ کر توڑنے کا حکم نہیں۔ اب تم کھیت میں جا کر سات اچھّی بالیں توڑ لاؤ۔"

لڑکا شوق سے کھیت میں چلا گیا۔ جہاں بُہت سی پکی ہُوئی بالیں آمنے سامنے دائیں بائیں موجود تھیں۔ مگر اُس نے یہ سمجھ کر کہ آگے اِس سے بھی اچھّی ملیں گی کوئی بال نہ توڑی۔ یہاں تک کہ دوسرے کنارے تک جا پہنچا۔ جہاں ابھی کچّی بالیں تھیں۔ جی میں آیا کہ کھیت میں جا کر اچھّی بالیں توڑ لائے مگر پیچھے مُڑ کر نہ دیکھنے کی شرط ہو چُکی تھی۔ اِس لیے پشیمانی کے ساتھ خالی ہاتھ پلٹنا پڑا۔

باپ نے کہا۔ "بیٹا! کیا کوئی بھی اچھّی بال تمہیں نظر نہیں آئی۔"

اُس نے جواب دیا۔ "کھیت کے اِس کنارے کی بالوں میں تو ایک سے

ایک اچھّی تھی مگر میں نے یہ سمجھ کر کہ آگے اِس سے بھی اچھّی مل جائیں گی، اُنہیں نہیں توڑا اور اِس طرف کی بالیں ابھی کچّی تھیں۔"

باپ نے کہا: "نادان لڑکے! تُو نے نادانی سے ناحق وقت کھو دیا۔ اَب تو دوبارہ جا کر بالیں توڑ نہیں سکتا۔"

بیٹے نے اپنی نادانی پر شرم اور افسوس کے ساتھ سر جھکا لیا تو باپ نے کہا۔ "بس یہی وقت کی مثال ہے، جو ایک دفعہ جا کر پھر کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ دانا رہی ہے جو ہر وقت خوشہ چُننے کو تیّار رہے۔ اور بے فائدہ اُمّیدوں میں کبھی وقت نہ کھوئے۔

ہُنر کی دولت

کسی جزیرے میں ایک امیر رہتا تھا۔ جِسے شکار کا بہت شوق تھا مگر شِکار کو جاتے ہوئے ایک جگہ کسی غِریب نوکریاں بُننے والے زمین پڑتی تھی۔ اُس زمین میں نرسل اُگے ہوئے تھے۔ اُس کھیت کی ناہمواری اور نرِسلوں میں سے گُزرنے کی تکلیف امیر کو بُہت ناگوار معلُوم ہوتی تھی۔

ایک دِن امیر نے غریب کو بُلا کر کہا: ”تم یہ زمین ہمیں دے دو۔“

غریب نے جواب دیا"حضور! میرا تو گُزارہ اِسی پر ہے۔ میں بیچنا نہیں چاہتا۔" اِس پر امیر ناراض ہو گیا۔ پہلے تو اُس نے غریب کو خوب پِٹوایا۔ پھر زمین پر اُگے ہوئے تمام نرسلوں کو آگ لگوا کر جلا دیا۔ جس پر غِریب روتا ہُوا بادشاہ کے پاس چلا گیا۔

بادشاہ نے امیر کو بُلا کر حال پوچھا تو امیر نے جواب دیا۔ "بے شک میں نے اِس ذلیل آدمی کو اِس لیے مارا اور اِس کے کھیت کو جلایا ہے کہ اِس نے میرے حُکم کی تعمیل نہ کی تھی۔ بادشاہ نے فرمایا۔ "تُم نے دولت کے جھوٹے غُرور میں ایک گناہ غریب کو ناحق تکلیف دی اور بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ تمہارا پَر دادا اِس سے بھی زیادہ غریب تھا جو ہمارے ہی گھرانے کی بدولت اتنی دولت کا مالک ہو گیا۔ جس کے ورثے پر اِس وقت تُم اِتنے مغرُور ہو رہے ہو۔ میرے نزدیک یہ غریب تُم سے اِس لیے بہتر ہے کہ اپنی محنت سے روزی کماتا ہے۔"

اب بادشاہ نے حکم دیا کہ امیر اور ٹوکریاں بُننے والے کو بالکل ننگا کر کے ایک غیر آباد جزیرے میں چھوڑ دیا جائے۔ اِس حکم کی تعمیل میں دونوں کو ایک ہفتے کے لیے ایک اَیسے جزیرے میں اُتار دیا گیا، جہاں صرف جنگلی آدمی رہتے تھے۔ جنگلیوں نے اُنہیں دیکھ کر پہلے تو مارنا چاہا۔ مگر ٹوکریاں بُننے والے نے اُنہیں اشاروں کے ذریعے سے منّت سماجت کر کے سمجھایا کہ ہم تمہاری خدمت کریں گے۔ ساتھ ہی وہاں سے نرسل لے کر ایک ٹوپی بُنی اور ایک جنگلی کے سر پر پہنا دی۔ جنگلی اِس تاج سے اِس قدر خُوش ہوئے کہ اُس کے پاس ٹوپیاں بنوانے کے لیے ہر وقت اُن کی بھیڑ رہنے لگی۔ مگر ننگے امیر کی سخت شامت آئی کہ ٹوپیاں نہ بنا سکنے کی وجہ سے اُنہوں نے اُسے مار مار کر بے ہوش کر دیا۔

آخر امیر نے جان سے تنگ آ کر ٹوپیاں بُننے والے سے کہا۔ "اگر تُم مُجھے اِن وحشیوں سے چھڑا دو تو میں گھر پہنچتے ہی آدھی جائیداد تمہاری نذر کر

دوں گا۔"

یہ سُن کر غریب ٹوکری والے نے جنگلیوں کو اِشارے سے سمجھایا کہ یہ میرا مدد گار ہے۔ اِسے کُچھ نہ کہو۔ جس پر جنگلیوں نے امیر کو پھر نہ چھیڑا بلکہ ٹوکری والے کے ساتھ اُسے بھی کھانا دینے لگے۔

جُوں تُوں کر کے ہفتہ ختم ہوا تو ایک سرکاری کشتی آ کر اُنہیں یہاں سے پھر بادشاہ کے رُوبرُو لے گئی۔ مگر اب تو امیر کی یہ حالت تھی کہ :ع

کاٹو تو لہو نہیں بدِن میں

بادشاہ نے سب قصّہ سُن کر امیر سے فرمایا۔" تُم نے دیکھ لیا دَولت کا محل کیسا ناپائدار اور اُس پر غُرور کرنے والا کیسا احمق اور نالائق ہے، اصلی دولت مند وہی ہے جو ہُنر جانتا اور محنت کر سکتا ہے۔ اب جاؤ اپنا وعدہ پورا کرو اور اِس غریب کو اپنی آدھی جائیداد بانٹ دو۔"

امیر نے گھر پُہنچ کر اِقرار کے مُطابق آدھی جائیداد غریب کے حوالے کر دی اور اِس طرح غریب نے اپنے صبر کا پھَل پالیا۔

دیانتداری کا نتیجہ

ایک امیر کی دولت پر چند ڈاکوؤں نے چھاپہ مارنے کی تجویزیں کیں۔ جس کا امیر کو بھی پتا چل گیا اور وہ چھ لاکھ روپیہ سوداگر کے پاس رکھ کر خود کسی دوسرے شہر چلا گیا۔

سوداگر نے پہلے تو امانت رکھنے سے اِنکار کر دیا۔ مگر آخر اِس شرط پر

روپیہ رکھ لیا کہ چب گیا تو واپس دے دیا جائے گا اور لُٹ گیا تو نہ امیر لین دار نہ سوداگر دین دار۔ امیر کے چلے جانے کے بعد سوداگر نے وہ تمام روپیہ ایک میدان میں گاڑ دیا۔ڈاکوؤں نے امیر کے یہاں کُچھ نہ پایا تو پلٹتے ہوئے سوداگر کے گھر بھی آ پہنچے۔ جس نے اُنہیں پچاس ہزار کے قریب اپنا مال دِکھا کر کہہ دیا کہ میرے پاس اِس کے سوا اور کُچھ نہیں۔

ڈاکو یہ بڑی رقم پا کر خوشی چلے گئے۔ جس کے تھوڑے دِنوں بعد سوداگر نے چُپکے چُپکے روپیہ نکال کر تجارت پر لگا دیا۔چار سال گزار کر امیر واپس آیا تو شہر کے سب لوگوں سے معلوم ہوا کہ آپ کے مکان سے پلٹتے ہوئے ڈاکوؤں نے سوداگر کو لوٹ لیا تھا۔

یہ خبر سُن کر امیر نے اقرار کے بموجب سوداگر سے روپیہ مانگنے کا خیال چھوڑ دیا۔

جب امیر کو آئے ہوئے دو مہینے گُزر گئے اور اُس نے سوداگر سے کُچھ نہ پوچھا تو ایک دِن سوداگر نے خود جاکر امیر سے کہا۔ ”آپ نے اب تک اپنا روپیہ کیوں نہیں مانگا۔“

امیر نے کہا۔ ”میں تو اقرار کے مطابق تمہارے لُٹنے کی خبر سُن کر اپنا روپیہ بھُلا چکا ہوں۔“

سوداگر نے جواب دیا۔ ”لُٹنے کی خبر تو درست ہے۔ مگر جتنا روپیہ لُٹا تھا وہ میرا اپنا تھا۔ آپ کا ایک الگ جگہ گاڑ دینے کی وجہ سے بچ گیا۔ جِسے تھوڑے دِنوں بعد میں نے تجارت پر لگا دیا اور آب آپ اِسے پانچ فیصدی سُود سمیت لے لیجیے۔“

یہ سُن کر امبر نے صرف اصل روپیہ لے کر سُود کی رقم بالکل چھوڑ دیا۔ اور تمام بادشاہوں کو سوداگر کی ایمان داری کی حکایت اور تعریفیں لکھ

بھیجیں۔ کہ "یہ بڑا ہی دیانتدار ہے۔ جس پر اِس کی مہاجنی کوٹھیاں دُنیا بھر میں پھیل گئیں۔"اِس سوداگر کا نام رُوتھ شیلڈ تھا۔ جِس کا ساہوکارہ اُس وقت تمام دُنیا میں سب سے معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اُس کی پُونجی صرف دیانت داری تھی۔ اگر تُم بھی ہر معاملے میں ایسی ہی سچّائی دِکھاؤ تو وہ دولت جس کی تلاش میں پھِرتے ہو خود تمہیں تلاش کرتی پھرے۔

اگر رُوتھ شیلڈ چھ لاکھ کے لیے بے ایمانی کرتا تو آج پدہوں کا مالک ہر گز نہ ہوتا اور نہ اِس رُتبے کو پہنچتا کہ دُنیا بھر کی بادشاہتیں اُس کی قرض دار ہوتیں۔

دو بھائی

دو بھائیوں کو جیب خرچ کے لیے گھر سے ایک ایک پیسہ روز مل جایا کرتا تھا۔ چھوٹے کی تو یہ عادت تھی کہ کبھی خرچ کرتا اور کبھی اُس صندُوق میں ڈال دیتا جو مدرسے میں غریب بچّوں کی امداد کے لیے رکھا رہتا تھا۔

بڑے بھائی کی یہ حالت تھی کہ جب مدرسے میں کھیلنے کی چھٹّی ہوتی تو وہ مدرسے کے مِٹھائی والے کی دُکان پر جا موجود ہوتا۔ بھلا اُس کی رنگا رنگ مِٹھائیوں کے رُوبرُو اُس کا ایک پیسہ کیا چیز تھا۔ دس پندرہ دِن تو اُس نے اِس طرح گزارہ کیا کہ آج لڈّو لے لیے تو کل بالُوشاہی۔ ایک دِن جلیبیاں تو دوسرے دِن برفی۔ مگر اِس سے تسلّی کب ہوتی؟ اُس نے اُدھار لینا شروع کیا تو چند روز میں دو روپے اُس کے ذمّے ہو گئے۔

دُکان دار نے روپے مانگے تو یہ گھبرایا کہ ماں باپ کی آمدنی زیادہ نہ ہونے کے باعث پیسے کے نہ ملنے کی اُمّید تو کیا الٹا مار پٹنے کا ڈر تھا۔

آخر ایک دِن دُکاندار نے بستہ چھین لیا کہ روپے لاؤ گے تو بستہ دوں گا۔ اِس پر دوسرے دِن اُسے مدرسے سے غیر حاضر ہونا پڑا۔ چھوٹے کو خبر ملی تو اُس نے پہلے تو بڑے بھائی کو سمجھایا۔ پھر دُکاندار کی منّت کی کہ اُس کا بستہ دے دو۔ آج سے دو پیسے روز دے کہ میں تمہاری رقم چُکا دوں گا۔

چنانچہ دُکان دار نے بستہ دے دیا۔ چھوٹا لڑکا بڑے بھائی کا اور اپنا ملا کر دونوں کے دونوں پیسے دُکاندار کو دے دیتا۔ اس طرح دو مہینے میں یہ قرض اُتر گیا اور ساتھ ہی بڑے کو بھی کفایت کی عادت پڑ گئی۔ چنانچہ اِس کے بعد پھر اُس نے کبھی قرض نہ لیا۔

کوئی اور بھی پڑھ لے

محمد صادق نامی ایک لڑکا یُوں تو لکھا پڑھا تھا مگر کوئی امتحان پاس نہ کرنے کے سبب سرکاری نوکری حاصل نہ کر سکتا تھا اور گھریلو نوکریاں اُسے پسند نہ تھیں۔ آخر سوچ سمجھ کر اُس نے جوتوں کی ایک دُکان کھول لی۔

دُکان کی پُونجی تھوڑی تھی مگر پھر بھی اُسے اتنا مِل جاتا تھا جس سے میاں بیوی کا گزارہ چل سکے۔ لیکن تھوڑے ہی دِنوں میں بیوی مر گئی اور یہ

غریب اکیلی جان رہ گیا۔ بیوی کو مرے ہوئے چھ مہینے ہوئے تھے کہ بھائی بھی بھاوج سمیت چل بسا اور صرف سات برس کا ایک بھتیجا اُن کی نشانی رہ گیا۔ لڑکے کا اور کوئی سہارا نہ تھا۔ چچا نے اپنے پاس رکھ کر پڑھنے کے لیے مدرسے میں داخل کرا دیا۔

تھوڑی مدّت میں لڑکا چل نکلا تو اُسے زائد وقت میں چچا نے خود پڑھانا لکھانا شروع کر دیا۔

ایک دِن صادق کو خیال آیا کہ اگر اِسی وقت میں کوئی اور بھی پڑھ لیا کرے تو میرا کیا ہرج ہے۔

یہ سوچ کر اُس نے تمام محلّے کے غریب لڑکوں کو بُلا لیا اور بغیر فیس کے پڑھانا شروع کر دیا۔ جس سے تھوڑے ہی دِنوں میں اُس کی دُکان ایک اچھّا مدرسہ بن گئی۔ ہر سال بُہت لڑکے پڑھ کر چلے جاتے اور بہت سے

نئے غریب بچّے اُن کی جگہ آ سنبھالتے۔

دو چار سال میں اُس کا بھتیجا تو سکول پڑھ پڑھا کر کالج میں داخل ہو گیا مگر یہ اِسی طرح کام کرتا رہا۔ اِس کے پانچ سال بعد لڑکا بی اے ہو کر کسی دفتر میں نوکر ہو گیا اور چچا سے کہا کہ "اب آپ آرام کریں۔ میری آمدنی کافی ہے۔" مگر صادق نے آخری دم تک نہ دُکان نہ چھوڑی، نہ غریبوں کا پڑھانا موقُوف کیا۔

صادق کے مرے ہوئے مدّت ہو چُکی ہے لیکن اِس بابرکت دُکان پر اب بھی اکثر پرانے شاگرد آنکلتے ہیں اور اپنے نیک دِل اُستاد کی یاد میں دُکان ہی کو سلام کر جاتے ہیں۔

بُردباری کا نتیجہ
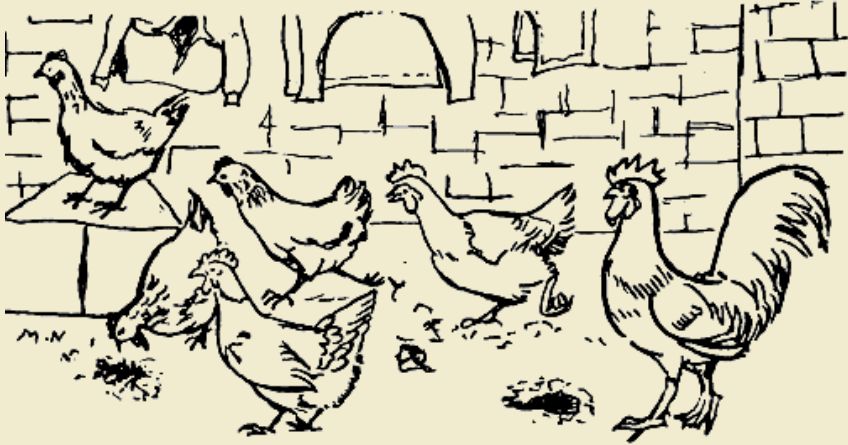
ایک محلے میں دو ہمسائے پاس پاس رہتے تھے۔ ایک بڑا لڑاکا تھا اور دوسرا دھیما اور دانا۔

دانا کے یہاں کُچھ مُرغیاں پَلی ہوئی تھیں مگر اِس بات کا وہ ہمیشہ خیال رکھتا کہ ہمسایوں کو تکلیف نہ ہو۔ باہر جاتے وقت مُرغیوں کو دانہ پانی دے کر بند کر جاتا اور جب گھر آتا تو کھول دیا کرتا تھا۔

ایک دِن یہ گھر میں موجود نہ تھا کہ کِسی طرح مُرغیاں کھانچے سے باہر نکل آئیں اور اُنہوں نے لڑاکے ہمسائے کے گھر جا کر کہیں بیٹ کر دی۔ کہیں زمین کھود کھود کر گڑھے ڈال دیے۔ غرض ہر جگہ کوڑا کرکٹ پھیلا دیا۔

لڑاکے نے دیکھا تو مارے غصّے کے بیسیوں ہی گالیاں دیں اور غصّے میں ایک مُرغی کی گردن بھی مروڑ ڈالی۔

یہ غصّے میں بھرا ہوا ابھی بَک ہی رہا تھا کہ دانا بھی آ پہنچا۔ جس سے گھر والوں نے شکایت کی کہ اِس ہمسائے نے ناحق گالیاں دے کر اِتنا شور مچا رکھا ہے۔ ذرا جا کر پوچھو تو سہی۔ اگر جانور آپ سے آپ نِکل گئے تو ہمارا کیا قصور؟"

عقل مند نے سوچا کہ ایسے لڑاکے سے سمجھ داری کی اُمّید فضول ہے اور

ایسی ذرا ذرا سی بات پر ہمسائے سے دُشمنی رکھنا بھی حماقت۔ دانائی یہ ہے
کہ اِس کی درُستی کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ سوچ کر وہ ہمسائے کے گھر گیا اور نرمی سے کہا۔ "آج کسی طرح آپ
سے آپ مُرغیاں نکل گئی ہیں، مُجھے افسوس ہے کہ اُنہوں نے آپ کو
دِق کیا۔ لائیے میں صحن میں جھاڑو دے دوں۔ اور کُچھ نقصان ہوا ہو تو وہ
بھی پورا کر دوں۔"

دانا کی اِن مُلائم باتوں نے لڑاکے کے دِل پر بڑا اثر کیا کیونکہ اُسے تو ایک
مُرغی کا گلا گھونٹ دینے سے ہمسائے کی طرف سے لڑائی جھگڑے کا
اندیشہ تھا۔ اُس نے فوراً دانا سے معافی مانگی اور پھر کبھی ایسی حرکت نہ کی
جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے۔

دیانتداری

کہتے ہیں نوشیر واں عادل اکثر راتوں کو بھیس بدل کر رعایا کا حال دیکھا کرتا تھا۔ ایک رات وہ کیسی زمیندار کے گھر پہنچا جو مہمان نوازی میں بہت مشہور تھا۔

نوشیر واں نے سوداگروں کے لباس میں اُس کے گھر جا کر دستک دی تو شریف زمیندار خوشی کے ساتھ دروازہ کھول کر اُسے اندر لے گیا اور

پورے شوق کے ساتھ مہمان کی خدمت کرنے لگا۔ کھانا کھلایا، بِستر دے کر چارپائی پر سُلایا۔ اور بہت دیر مُٹھّی چپّی کرتا رہا۔

صُبح بادشاہ نے چلنے کی تیّاری کی تو اُس نے چائے کے ساتھ ناشتالا کر مہمان سے پوچھا۔ "کسی اور چیز کی خواہش ہو تو فرما دیجیے تاکہ وہ بھی حاضر کی جائے۔"

بادشاہ دیکھ چُکا تھا کہ اِس شخص کے مکان کے ساتھ پُختہ انگوروں کا ایک عُمدہ باغ موجود ہے، مگر نہ رات کو اور نہ اب اُس نے انگور کھلائے۔ اِس لیے فرمایا، "مُجھے انگور بہت پسند ہیں۔ ہو سکے تو وہ بھی منگوا لیجیے۔"

یہ سُن کر زمیندار نے اپنے لڑکے سے کہا۔ " فلاں زمیندار کے پاس جاؤ اور میرا سلام دے کر کہو کہ ایک دو سیر پُختہ انگور اُدھار کے طور پر دے دیجیے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ ”آپ نے اپنے باغ میں سے انگور کیوں نہیں منگوائے۔“

زمیندار نے کہا کہ ”ابھی سرکاری آدمی اُنہیں دیکھ کر سرکاری حصّہ نہیں لے گیا اور جب تک وہ اپنا حق نہ لے جائے مُجھے ایک دانہ بھی کھانا اور کھلانا حرام ہے۔“

بادشاہ اوّل تو اُس کے برتاؤ ہی سے خوش تھا اب یہ ایمان داری اور دیانتداری جو دیکھی تو اور بھی خوش ہو گیا۔ اور ہمیشہ کے لیے باغ کا مالیہ بالکُل مُعاف کر دیا۔

منحوس میں ہوں یا آپ

ایک بادشاہ کے دو مُصاحبوں میں ایسی سخت دُشمنی تھی کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ اتّفاق سے ایک دِن بازار میں موقع پا کر ایک مُصاحب نے دوسرے کی بابت کہا۔ ”حضور کا یہ مصاحب اِتنا منحوس ہے کہ اگر کوئی شخص صُبح اُٹھ کر اُس کا مُنہ دیکھ لے تو دِن بھر کھانا نہیں ملتا۔ میں نے ہزار دفعہ آزما دیکھا ہے۔ ایسا شخص ہر گز حضور کی مُصاحبت کے

لائق نہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "اِس بات کو ہم تو مانتے نہیں۔ تُم کام والے آدمی ہو اگر کام کی زیادتی کے باعث کیسی دِن اُس کا چہرہ دیکھ کر بھوکے رہ گئے تو اُس بے چارے کا کیا قصور۔"

مُصاحب نے کہا۔ "میں نے جھوٹ عرض نہیں کیا۔ حضور تو بادشاہ ہیں۔ خُدا کے فضل سے کسی چیز کی کمی نہیں۔ کسی دِن خود آزما دیکھیں۔"

بادشاہ نے حکم دیا کہ اچھا آج اِسے ہمارے سونے کے کمرے میں سُلایا جائے اور اُسی کو صُبح ہمارے جگانے کے لیے کہہ دیا جائے۔"

آخر ایک رات مُصاحب کو شاہی محل میں سُلایا گیا۔ اور اُسی نے بادشاہ کو سویرے جگا بھی دیا۔

اُس دِن کُچھ ایسا اتّفاق ہو گیا کہ بادشاہ کو بہت سے کام پیش آ گئے جن میں نہ دِن کا کھانا کھایا۔ نہ تیسرے پہر کا نقل فرمایا۔ رات کو خاصہ چُنا گیا تو

چُغل خور نے خوشی خوشی عرض کی۔ ”حضور مُلاحظہ فرمائیں۔ میری بات پوری ہوئی یا نہیں؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”ہاں! ہاں! بے شک تُم سچّے ہو۔ جب میرا یہ حال ہوا ہے تو اُس کا منہ دیکھ کر اَوروں کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ بہتر یہی ہے کہ اِس منحوس کو قتل کرادیا جائے۔“

بادشاہ کا حکم سُن کر سپاہی اُسے قتل کرنے کے لیے لے جانے لگے تو اُس نے کہا: ”حضور! ایک عرض میری بھی سُن لیجئے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”شوق سے کہو۔“

اس نے عرض کی۔ ”حضور! آپ میرا مُنہ دیکھ کر اُٹھے اور ایک وقت نہیں تو دوسرے وقت کھانا کھالیا۔ لیکن میں آپ کا چہرۂ مبارک دیکھ کر اُٹھا ہوں تو بت گناہ قتل کا حکم ہو رہا ہے۔ آپ ہی انصاف فرمائیں کہ

منحوس میں ہوں یا آپ؟“

یہ سُن کر بادشاہ سوچ میں پڑ گیا اور فرمایا۔” کوئی آدمی منحوس نہیں ہو سکتا۔ یہ سب اتّفاق کی باتیں ہیں۔ کسی دِن کام ہی ایسا نکل آیا جس میں کھانا نہ کھایا گیا۔“

یہ کہہ کر اُس سے عُذرِ معذرت کر کے معافی مانگی اور عزّت کے ساتھ رُخصت کر کے چُغل خور کو خوب شرمندہ کیا۔

ماں باپ کے لاڈلے

ایک دِن اکبر بادشاہ درشنی جھروکے میں مخلُوق کی آمد ورفت کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ بیربل بھی حاضر تھا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ "بیربل! کُچھ پہچان سکتے ہو۔ اِن میں سب سے زیادہ ماں باپ کے لاڈلے کون لوگ ہیں؟"

آنے جانے والوں میں بعض فقیر محتاج بھیک مانگ رہے تھے اور بعض

مزدور سَر پر بوجھ اُٹھائے چلے جا رہے تھے۔ بِیربل نے اُن لوگوں کی طرف اِشارہ کر کے عرض کی۔ ”جہاں پناہ! ماں باپ کے بڑے لاڈلے یہ لوگ ہیں۔“

بادشاہ نے فرمایا۔ ”یہ تُم نے اُلٹی بات کہی ہے۔ لاڈلوں کا مانگنے اور مزدوری کرنے سے کیا تعلّق؟“

بِیربل نے چوب دار بھیج کر اُن میں سے چند فقیر اور چند مزدور بُلوا لیے اور بادشاہ کے سامنے اُن کے باپ دادا کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کوئی کسی عُہدہ دار کا بیٹا ہے، کوئی سوداگر کا، کوئی جاگیر دار کا، اور کوئی ساہوکار کا۔

ماں باپ نے لاڈ پیار میں تعلیم و تربیت پر توجّہ نہ کی۔ اُنھوں نے بڑی محبّتوں میں بیٹھ کر مکان، زمین، گھر کا زیور اور کپڑے تک بیچ کھائے۔ اثاثہ ختم ہو چُکا اور قرض نہ ملا تو جو زیادہ لاڈلے تھے بھیک مانگنے لگے۔ جو

ذرا بھی غیرت رکھتے تھے وہ محنت مزدوری کرنے لگے۔ مگر عادت نہ ہونے سے اِس میں بھی ٹھوکر پر ٹھوکر کھارہے ہیں۔

بادشاہ کو اُن کی طرف سے تسلّی ہوئی تو کہا۔ ” اب کُچھ ایسے لوگ بھی دِکھاؤ جِن سے ماں باپ نے کوئی لاڈ نہ کیا ہو۔“

بیربل نے عرض کی۔ ”جہاں پناہ! اُن میں پہلے حضور، پھر خانہ زاد۔ حضور کے والد بادشاہ تھے مگر اُنہوں نے حضور کی تعلیم وتربیت پر ایسی توجّہ فرمائی، کہ گویا جہاں پناہ کو اپنی محنت سے روٹی کمانا ہے اور میں اگرچہ غریب کا بیٹا ہوں، مگر میرے باپ نے بھی عِلم و عقل سِکھانے میں کبھی بے موقع محبّت سے کام نہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضور نے جس قدر مُلک وِرثے میں پایا تھا، آج خُدا کے فضل و کرم سے اُس سے چَوگُنا آپ کے زیرِ حکم ہے۔ حالانکہ اگر حضور لاڈلے ہوتے تو اُس میں بھی کمی آجاتی اور فِدوی کو حضور کی عِزّت ملی تو حضور کی توجّہ نے مُصاحبوں میں شامل

کر لیا۔ پس اِسی لیے داناؤں کا قول کہ اولاد کو کھلائے سونے کا نوالہ اور
دیکھے شیر کی نظر۔“

ماں کی خدمت

گرمی کے دِنوں میں ایک امیر دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں سو رہا تھا اور نوکر باہر بیٹھا پنکھا کھینچ رہا تھا کہ آقا اور مُلازم دونوں کو نیند آگئی۔

گرمی کے مارے امیر کی آنکھ کھُلی تو اُس نے پانی کے لیے نوکر کو آواز دی مگر جواب نہ پا کر خود باہر نکلا تو دیکھا کہ نوکر بے خبر سو رہا ہے۔

یہ نوکر ایک لڑکا تھا جِس کی جیب میں تھوڑا سا باہر کو نکلا ہوا ایک خط رکھا

تھا۔ امیر نے یہ سمجھ کر کہ شاید ہمارے ہی نام کا ہو، اُسے کھِسکا کر پڑھا تو لکھا تھا۔

"برخوردار! دُعا کے بعد معلوم ہو تمہارا دو روپے کا منی آرڈر مل گیا۔ میں بہت خوش ہوئی کہ خُدا نے تمہارا روزگار لگا دیا۔ اُن میں سے ایک روپے کے تو میں نے گیہوں خرید لیے۔ ایک روپیہ بنئے کر دے دیا ہے جو اپنے پانچ روپے مانگ رہا تھا۔ اِسی طرح خرچ بھیجتے رہو گے تو پانچ مہینے میں اُس کا قرضہ اُتر جائے گا۔ خُدا تمہیں برکت دے۔

تمہاری ماں۔"

خط پڑھ کر امیر کے دِل پر لڑکے کی اور ماں کی خدمت کرنے کا اتنا اثر ہوا۔ اس نے چُپکے سے پانچ روپے اپنی میں سے نکال خط سمیت لڑکے کی جیب میں رکھ دیے اور اندر جا کر پھر آواز دی تو لڑکا جاگ اُٹھا اور جیب

بھاری معلوم ہوئی تو دیکھا کہ اُس میں پانچ روپے ہیں۔ بڑا گھبرایا اور مالک پاس پانی کا گلاس لے جا کر کہنے لگا۔ "حضور، ابھی ذرا سی دیر میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اِسی میں کسی نے پانچ روپے میری جیب میں ڈال دیے کہ مُجھے چور بنا کر پکڑوا دے۔ مگر خُدا جانتا ہے کہ میں نے خود روپے جیب میں نہیں ڈالے۔"

امیر نے کہا۔ "ڈرو نہیں! یہ روپے تمہیں خُدا نے ماں کی خدمت کرنے سے خوش ہو کر دِلوا دیے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم اُنہیں کرو گے کیا؟"

لڑکے نے کہا۔ "حضور اگر روپے میرے ہوتے تو میں اپنی ماں کو بھیج دیتا کہ بنیے کا قرضہ اُتار دے۔

امیر نے فرمایا۔ "گھبراؤ نہیں۔ یہ روپے ہم نے خود تمہاری جیب میں رکھے ہیں۔ بیشک ماں کو بھیج دو۔ اِن کے علاوہ آج سے ایک روپیہ مہینہ

تمہاری سچّائی کے انعام کا بھی دیا جائے گا کیونکہ خُدا سچّوں کو پسند فرماتا ہے۔“

وفادار نوکر

عبدالحمید ایک امیر لڑکا شہر کے مدرسے میں پڑھا کرتا تھا۔ یہ جب مدرسے میں آتا ایک نَوکر بستہ لیے ساتھ ہوتا۔ چھٹّی کا وقت آتا تو نوکر پھر آکر بستہ اُٹھا ساتھ ہولیتا۔

اِسی مدرسے کے لڑکوں میں دانِشمند ایک غریب لڑکا سب سے زیادہ ہوشیار اور محنتی تھا۔ یہ ہمیشہ آپ بھی سُتھرا رہتا۔ کتابیں بھی اُجلی اور

صاف۔ قلم، دوات، پنسل، سلیٹ، کاپیاں سب ٹھیک ٹھاک رکھتا۔ اور سبق بھی خُوب یاد کرلیتا۔

ایک دِن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ماسٹر صاحب نے وقت سے ایک گھنٹہ چھٹّی دے دی کہ مینہ برسنے لگے گا تو لڑکوں کو گھر جانا مُشکل ہو جائے گا۔

چھٹّی ہوتے ہی سب لڑکے بستے باندھ کر گھروں کو جانے لگے مگر عبد الحمید کا نوکر نہ آیا تھا۔ اُس نے دانشمند کے ساتھ باتیں شروع کر دیں کہ ذرا دیر گُزر جائے تو نَوکر آجائے۔

عبد الحمید نے کہا۔ ''بھائی دانشمند! نوکر لوگ بڑے کام کے چور ہوتے ہیں۔ دیکھو۔ ہمارے تین نوکر ہیں اور سب جانتے ہیں کہ مینہ کے دِن ذرا پہلے ہی چھٹّی ہو جاتی ہے۔ مگر اِن میں سے اب تک کوئی بھی نہیں

آیا۔"

دانشمند بولا۔ "سیٹھ صاحب! کرائے کے نوکر سب ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ مگر اصلی نوکر کبھی سُستی نہیں کرتے۔ دیکھیے میرے دس نوکر ہیں اور یہ سب میرے اشارے پر کام کرتے ہیں۔"

یہ سُن کر عبدالحمید سوچ میں پڑ گیا۔ کیونکہ وہ دانشمند کو جھُوٹا بھی نہ جانتا تھا اور نہ کبھی اِس نے اُس کا کوئی نوکر ہی دیکھا تھا۔ حیران ہو کر پوچھا۔ "تمہارے نوکر میں نے تو کبھی نہیں دیکھے۔"

دانشمند نے جواب دیا: "میرے نوکر تو ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور آپ بھی اُنہیں سب کے ساتھ روز دیکھتے ہیں۔"

یہ سُن کر عبدالحمید کو اور بھی اچنبھا ہوا۔ اور اُس نے کہا۔ "اُن میں سے دو ایک کے نام تو بتاؤ۔"

دانشمند نے جواب دیا۔ "ایک دو کیا! میں دسوں کے نام بتائے دیتا ہوں۔ سُنئیے دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ، دو پاؤں، ایک ناک اور ایک زبان۔ میرے ایسے وفادار نَوکر ہیں کہ دِل کے اِرادے تک جانتے اور فوراً حکم مانتے ہیں۔"

ماسٹر صاحب بھی دروازے میں کھڑے باتیں سُن رہے تھے۔ اُنہوں نے کہا۔ "دانشمند شاباش! بے شک تمہارے نوکر بڑے وفادار ہیں اور ایسی خدمت کرتے ہیں جو دوسرا کبھی نہیں کر سکتا۔ عبدالحمید! تُم بھی اپنے انہی نوکروں سے کام لیا کرو تو دوسروں کے کبھی محتاج نہ ہو۔"

ماسٹر صاحب کی بات عبدالحمید کے دِل میں گھر کر گئی۔ اُس نے بھی بستہ باندھ اکیلے گھر کی راہ لی اور پھر کبھی نوکر سے بستہ اُٹھوا کر نہ آیا۔

عقل کی فتح

ایک غریب آدمی نے سفر پر جاتے وقت کسی ساہُوکار کے پاس ایک ہزار روپیہ امانت رکھ دِیا تھا مگر نہ کوئی رسید لی، نہ کسی کو گواہ کیا۔

چھ مہینے بعد غریب سفر سے واپس آیا اور ساہُوکار سے روپے مانگے تو وہ صاف مُکر گیا کہ میں نے تمہاری کوئی امانت نہیں رکھی۔

یہ بے چارہ ہر روز ساہُوکار کے یہاں جاتا اور دِن بھر بیٹھا رہتا، مگر

ساہُوکار ایک نہ سُنتا۔ آخر بادشاہ کے پاس جا کر فریاد کی کہ "میں نے غَلَطی سے بغیر کِسی کو گواہ کیے اور رسید لیے ایک ہزار روپے فلاں ساہُوکار کے پاس امانت رکھتے تھے۔ اب آ کر مانگتا ہوں تو وہ اِنکار کرتا ہے۔ حضور میرے روپے دِلا دیں۔"

بادشاہ نے فرمایا۔ "قاعدہ قانون تو ساہُوکار کو پکڑ نہیں سکتا۔ مگر ایک تدبیر یہ ہے کہ کل تیسرے پہر میں سیر کرتا ہوا ساہُوکار کی دُکان کی طرف آؤں گا۔ تُم وہاں موجود رہنا۔ تمہیں جھُک کر سلام کروں گا۔ تُم بے پروائی سے جواب دے دینا۔ اور اِسی طرح اور باتیں بھی جو میں کروں تم معمولی دوستوں کی طرح جواب دیتے رہنا۔"

بادشاہ کی یہ تجویز سُن کر غریب دوسرے دِن سہ پہر کو ساہُوکار کی دُکان پر جا بیٹھا۔ اِتنے میں بادشاہ کی سواری آئی اور اُس نے غریب کو جھُک کر سلام کیا تو اُس نے معمولی طور پر جواب دے دیا۔ پھِر بادشاہ نے اُس کے

ہاتھ چوم کر کہا: "آپ کب تشریف لائے۔ ہم تو بہت دِنوں سے یاد کر رہے تھے۔"

اس نے کہا۔ "مجھے آئے ہوئے تو ایک ہفتہ ہو گیا ہے مگر آتے ہی کُچھ تکلیف میں پڑ گیا ہوں۔ اُس سے نِبٹ لوں تو حاضر ہوں گا۔"

بادشاہ نے فرمایا۔ "جو بات ہو ہم سے کہیے۔ ہم آپ کی مدد کریں گے۔"

غریب نے جواب دیا۔ "بہت اچھّا۔ ضرورت ہو گی تو عرض کروں گا۔"

اِس گفتگو کے بعد بادشاہ تو چلا گیا مگر ساہُوکار نے اُسی وقت اُس خوف سے غریب کے روپے گِن دیے کہ یہ بادشاہ سے میری شکایت نہ کر دے اور اِس طرح مقدمے کے بغیر غریب کے روپے نکل آئے۔

غرور کا انجام

اٹلی کا ایک بادشاہ حکومت اور دولت کے گھمنڈ میں غِریبوں سے بات تک کرنا بُرا جانتا تھا۔ اِس لیے اکثر لوگ اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔

ایک دِن یہ شکار میں کسی جانور کے پیچھے گھوڑا ڈالے اِتنی دُور نِکل گیا کہ نوکر چاکر سب بچھڑ گئے اور بادشاہ اکیلا رہ گیا۔

اِتنے میں ایک کسان نے بادشاہ کی رکاب پکڑ لی۔ اِس کسان کی شکل ہُو بہُو بادشاہ سے مِلتی تھی۔ فرق یہ تھا کہ اُس کی پوشاک اور حالت غریبانہ تھی۔

کسان نے عرض کی۔ "بادشاہ سلامت! میں تین دِن سے حضُور کی ڈیوڑھی پر بھوکا پیاسا چلّا رہا ہوں مگر کوئی میری فریاد نہیں سُنتا۔"

بادشاہ نے غریب کے میلے کپڑے دیکھ کر جھٹ ایک کوڑا لگا کر سامنے سے ہٹا دیا کہ "چل دور ہو۔ ہم ذلیل آدمیوں سے بات نہیں کر سکتے۔" غریب کسان کوڑا کھا کر ہٹ تو گیا مگر پھر بھی آہستہ آہستہ گھوڑے کے پیچھے چلتا رہا یہاں تک کے بادشاہ ایک تالاب پر پہنچ کر گھوڑے سے اُترا۔ باگ ڈور ایک درخت سے اٹکائی۔ تاج اور کپڑے اُتار کر ایک طرف رکھے اور نہانے کو تالاب میں اُتر گیا۔

یہ تالاب ایسے نشیب میں تھا کہ نہانے والے کو اوپر کا آدمی نظر نہ آ سکتا تھا۔ جب بادشاہ تالاب میں اُتر چُکا تو غریب کسان نے اپنے میلے کپڑے اُتار دیے۔ بادشاہ کے کپڑے پہن کر تاج سر پر رکھ لیا اور بادشاہی گھوڑے پر سوار فوراً رفو چکّر ہو گیا۔

کِسان بادشاہ تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ بادشاہی نوکر چاکر مِل گئے جنہوں نے اُسے بادشاہ سمجھ کر ادب سے سلام کیا اور یہ بھی بے جِھجک شاہی محلوں میں جا پہنچا۔

اصلی بادشاہ نہا کر تالاب سے باہر نکلا تو کپڑے، تاج اور گھوڑا کُچھ بھی موجود نہ تھا۔ بہت گھبرایا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا، ناچار غریب کسان کے مَیلے کپڑے پہنے اور کئی دِن تک فاقے جھیلنے اور بھولے بھٹکے پھرنے کے بعد شہر پہنچا۔ مگر اَب اُس کی یہ حالت ہوئی کہ جس نے بات کرتا کوئی مُنہ نہ لگاتا۔ اور جب یہ کہتا کہ میں تمہارا بادشاہ ہوں تو لوگ اُسے پاگل

سمجھ کر ہنس دیتے۔

دو تین ہفتے اِسی طرح گُزر گئے اور بادشاہ سخت پریشان ہو گیا کہ اِتنے میں اِس پاگل کا قصّہ بادشاہ بیگم نے بھی سُنا اور جب بُلوا کر اُس کے کپڑے اُتروائے تو سینے پر تِل کا نشان دیکھ کر اُس کی سچّائی کی تصدیق کی۔

کسان نے اصلی بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کہ کہا۔ "کیا تُم وہی شخص ہو جو دولت اور حکومت کے گھمنڈ میں غریبوں کی فریاد نہ سُنتے تھے؟ اُسی کی سزا دینے کو میں نے یہ سوانگ بھرا تھا۔ اگر تُم گھمنڈ چھوڑ کر رحم و انصاف کا اِقرار کرو تو تمہارا تاج و تخت واپس دینے کو تیّار ہوں۔ ورنہ ابھی قتل کا حکم بھی دے سکتا ہوں۔"

یہ سُن کر بادشاہ نے عاجزی اور ندامت کے ساتھ اپنی غَلَطی کو تسلیم کیا۔ اور کسان اُسے تخت و تاج دے کر گھر کو چلا گیا۔ جِس کے بعد بادشاہ نے

اپنی عادتوں کی اصلاح کرلی اور چند ہی دِنوں میں نیک نام مشہور ہو گیا۔

لالچ بُری بَلا ہے

ایک فقیر نے کسی جنگل میں کوئی اتنا بڑا خزانہ دیکھ پایا تھا جِس کے اُٹھا لے جانے کی اُس میں طاقت نہ تھی۔

تھوڑے دِنوں میں ایک سوداگر کا بھی اُس جنگل میں گزر ہوا جو کہیں اپنا مال بیچ کر آٹھ خالی اونٹ گھر کو واپس لیے جا رہا تھا۔ فقیر نے دیکھا تو

سوداگر سے کہا۔ ”میں تمہیں اِس شرط پر ایک بہت بڑے خزانے کا پتا دے سکتا ہوں کہ جتنے اونٹ اِس خزانے سے بھر و اُن میں سے آدھے یا چوتھائی مُجھے بھی دے دو۔“

سوداگر سُنتے ہی آدھے اونٹ دینے پر راضی ہو گیا۔ جس پر فقیر نے خزانے کا پتا دے کر اُس کے آٹھوں اونٹ تو دولت سے بھر وادیے اور ایک چھوٹی ڈبیا جس میں ایک بہت بڑا لال تھا خود اُٹھالی.

سوداگر نے روپے اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے چار اونٹ پہلے تو خوشی سے فقیر کے حوالے کر دیے۔ مگر دِل میں خیال آیا کہ فقیر تو چوتھائی پر بھی راضی تھا۔ میں نے خواہ مخواہ نِصف کہہ دیا۔ اب بھی پوچھوں تو شاید دے ہی ڈالے۔

یہ سوچ کر فقیر سے کہا۔ ”سائیں صاحب! بے شک میں نے آدھے

اونٹ دینے کو کہا تھا مگر آپ نے خود چوتھائی ہی مانگی تھی۔ پس آپ اپنی بات پر قائم رہیں، تو دو اونٹ مُجھے اور ملنے چاہئیں۔"

فقیر نے کہا۔ "بابا! تُم چاہو تو اَب بھی دو اور لے لو، مُجھے دو ہی بہت ہیں۔"

سوداگر نے اپنے چار اونٹوں میں یہ دو بھی ملا لیے مگر لالچ نے اب بھی اُسے چین نہ لینے دیا اور فقیر سے کہا۔ "سائیں مولا! آپ تو فقیر آدمی ہیں اور میں دُنیا کا کُتّا۔ باقی دو اونٹ بھی مُجھی کو بخش دیجیے تو میرے بال بچّے آپ کو دُعادیں گے۔"

فقیر نے کہا: "اچھّا بابا! تمھاری یہی مرضی ہے تو لو یہ بھی لے جاؤ۔"

سوداگر سُنتے ہی آٹھوں اونٹ لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور خوشی خوشی گھر کو چل دیا مگر راستے میں خیال آیا۔ گو دولت تو بہت ہے مگر فقیر کے پاس جو

ایک لعل رہ گیا اگر وہ بھی مِل جاتا تو بڑا لُطف ہوتا۔

اِس خیال کے آتے ہی اُس نے اُونٹوں کو تو نوکروں سمیت آگے روانہ کر دیا اور خود فقیر کی طرف پلٹ پڑا۔

سوداگر واپس آیا تو فقیر کہیں نکل گیا تھا۔ یہ لالچ کا مارا دِن بھر ڈھونڈتا پھرا۔ اِتنے میں اونٹ کہیں کے کہیں جا پہنچے۔ سُورج ڈوبنے لگا تو بہت گھبرایا کہ جنگل میں کھاؤں گیا اور رہوں کہاں؟"

اِتنے میں پاس کی جھاڑی میں کسی شیر نے دھاڑنا شروع کر دیا اور جب تک یہ کہیں بھاگے وہ بُو پا کر سر پر آ پہنچا اور دم بھر میں سوداگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

زبان کا زخم

ایک بادشاہ کسی جنگل میں اکیلا جارہا تھا کہ اچانک اُسے شیر نے آلیا۔ مگر اتّفاق سے کوئی کسان بھی اُسی وقت آ نکلا۔ جِس کے ایک ہاتھ میں تو ٹیڑھی تِرچھی لکڑی تھی اور دوسرے میں درانتی۔

شیر بادشاہ پر حملہ کرنے ہی کو تھا کہ کِسان نے پھُرتی سے ٹیڑھی لکڑی اُس کے گلے میں دے کر ہاتھ کی درانتی سے پیٹ چاک کر دیا۔ جس سے بادشاہ کی جان بچ گئی اور شیر مارا گیا۔

بادشاہ نے کِسان کو اِس اِمداد کے صلے میں گاؤں کی نمبرداری کے ساتھ بُہت سی زمین بھی عطا فرما دی اور کہا کہ "ہر ایک تہوار کے موقع پر ہمارے یہاں دوستوں، رشتہ داروں کی جو خاص دعوت ہوتی ہے اُس میں تُم بھی آیا کرو کہ تُم بھی اب میرے سچّے دوست ہو۔"

تھوڑے دِنوں میں بادشاہ کے یہاں دعوت ہوئی تو کِسان بھی آیا۔ مگر اوّل تُو اُس کے کپڑے موٹے جھوٹے تھے۔ دوسرے بادشاہوں کے پاس اُٹھنے بیٹھنے کا ادب و سلیقہ بھی نہ جانتا تھا۔ اُس سے کئی غَلَطیاں ہوئیں۔ کھانا آیا تو یہ بادشاہ کے ساتھ ہی کھانے کو بیٹھ گیا۔

بادشاہ نے ناراض ہو کر کہا۔ ”تُم بڑے گنوار آدمی ہو۔ چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں کر سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ اِسی وقت اُٹھ جاؤ۔“

کِسان شرمندہ ہو کر چلا آیا اور کئی سال تک بادشاہ کے پاس نہ گیا۔

ایک دِن بادشاہ گاڑی پر سوار ایک تنگ پُل پر جا رہا تھا کہ ایک طرف سے گاڑی کا پہیّہ نِکل گیا اور اگر اُسی وقت سہارا دے کر اُس کی اُونچائی دوسرے پہیّے کے برابر نہ کر دی جاتی تو ضرور تھا کہ بادشاہ دریا میں گِر جاتا۔

حُسنِ اِتّفاق کہو یا تقدیر کہ یہی کِسان اُس وقت بھی وہاں موجود تھا۔ اُس نے نکلتے ہی گاڑی کو اپنے بازو پر سنبھال کر گِرنے سے بچا لیا۔

بادشاہ کِسان کی اِس دوبارہ خدمت سے اِس قدر خُوشنُود ہوا کہ اپنے ساتھ لے جا کر کئی دِن مہمان رکھا اور چلتے وقت بہُت سا انعام دے کر

ہمیشہ آنے کی تاکید کر دی۔

کسان نے کہا۔ "بادشاہ سلامت! میں نے دو دفعہ حضور کی جان بچائی ہے۔ اب حضور بھی ایک میرا کہا مان لیں کہ میری پیشانی میں درد ہے اور اِس کا حکمی عِلاج یہ ہے کہ آپ ایک تلوار کا ہاتھ مار دیں۔ اِس میں اگر ہڈّی بھی ٹوٹ جائے تو کوئی خوف نہیں۔ میں چند دِن میں اچھّا ہو جاؤں گا مگر یہ درد جاتا رہے گا۔"

بادشاہ پہلے تو ہرگز مانتا نہ تھا، مگر کسان کے سخت اصرار کرنے اور زور دینے پر آخر اُس نے تلوار کا ہاتھ مار ہی دیا جس سے ایک انچ گہرا زخم پڑ گیا۔

کسان زخم کھا کر گھر کو چلا گیا اور چند روز میں معمولی علاج سے زخم اچھّا ہو گیا۔ مگر جب کُچھ دِن بعد بادشاہ نے اُسے اپنے پاس بُلا کر حال پُوچھا تو

کسان نے عرض کی "بادشاہ سلامت! حضور مُلاحظہ فرمالیں کہ خُدا کے فضل سے تلوار کے زخم کا اب نشان تک نہیں رہا مگر پہلی دعوت میں حضُور کے بد تمیز گنوار کہنے اور نِکال دینے کا زخم اب تک میرے دِل پر ویسے کا ویسا ہرا ہے۔"

یہ سُن کر بادشاہ نے گردن جھُکا لی۔ اور کہا۔ "بے شک تُم سچّے ہو۔ میں ہی غَلَطی سے داناؤں کے اِس قَول کو بھُول گیا تھا کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر زبان کا نہیں بھرتا۔

سونے کی تین اِینٹیں

ایک دِن حضرت عیسیٰؑ کہیں جا رہے تھے۔ ساتھ ایک اور آدمی بھی ہو لیا۔ آپ نے ایک رُومال میں تین روٹیاں باندھ کر اُس کے حوالے کیں کہ اِنہیں سنبھال رکھّو۔ جہاں بھُوک لگے گی مِل کر کھالیں گے۔

ساتھی کو بھُوک لگی تو اُس نے موقع پا کر چُپکے سے ایک روٹی نکال کر کھالی اور رومال ویسے کا ویسا باندھ دیا۔

تھوڑی دُور چل کر آپ بھی ایک جگہ بیٹھ گئے کہ آؤ دوست اَب کھانا کھا لیں۔ مگر رُومال کھولا تو اُس میں صرف دو ہی روٹیاں باقی تھیں۔

آپؑ نے ساتھی سے پوچھا۔ "تیسری کہاں ہے؟ "لیکن وہ صاف مُکر گیا کہ "جناب! مُجھے کیا معلوم؟ دو ہی بندھی ہوں گی۔"

کھانا کھا کر آگے چلے تو آپؑ نے اُسے دو تین مُعجزے دِکھائے کہ جو دیکھتا حضرت کی عظمت کا یقین کر لیتا مگر اب بھی جب آپ نے اُس سے تیسری روٹی کے لیے پُوچھا تو اُس نے وہی پہلا جواب دیا کہ مُجھے تو کُچھ خبر نہیں۔ گھر سے دو ہی روٹیاں آئی ہوں ہوں گی۔"

اِتنے میں چلتے چلتے آپ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سونے کی تِین اِینٹیں رکھی تِھیں۔ آپ نے فرمایا۔ "دوست! اِس میں سے ایک تو تُم لے لو۔ دوسری میں اور تِیسری اُس آدمی کے لیے رہنے دو جِس نے ہماری

تیِسری روٹی کھائی تھی۔"

یہ سُن کر لالچی ساتھی فوراً بول اُٹھا" :جناب! وہ روٹی تو میں نے ہی کھائی تھی اور آب مُجھی کو ایک کی جگہ دو اِینٹیں ملنی چاہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "دوست مجھے اِن کی بالکل ضرورت نہیں۔ تینوں کی تینوں تمہارا مال ہیں۔"

یہ کہہ کر آپ تو وہاں سے چلے آئے۔ اور وہ لالچی اِینٹوں کے لیے سوچنے لگا کہ اُنہیں کس طرح لے جاؤں اور کہاں چھُپاؤں۔

اِتنے میں تین بھُوکے چور بھی کسی طرف سے آنکلے۔ اور اُنہوں نے سونے کی اِینٹیں ایک کمزور آدمی کے پاس دیکھ کر اُسی وقت اُسے جان سے مار دیا۔ یہ تینوں چور بھُوک سے بے تاب ہو رہے تھے۔ اِس لیے ایک ساتھی کو گاؤں میں کھانا پکوانے بھیج دیا کہ کھانے کے بعد سب

ایک ایک اِینٹ لے کر گھر کی طرف چل دیں گے۔

اب لُطف یہ ہوا کہ اُن میں سے جو آدمی کھانا پکوانے گیا تھا راستے میں اُس کی نیّت بدل گئی اور وہ کھانے میں زہر ملا کر لے آیا کہ جب کھانا کھا کر یہ دونوں مر جائیں گے تو میں اکیلا ہی تینوں اِینٹیں سنبھال لوں گا۔

اُدھر اُن دونوں نے جو اِینٹوں کے پاس بیٹھے تھے، ارادہ کیا کہ کھانا کھا کر تیسرے کو جان سے مار دیں اور ہم ایک کی ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ بانٹ لیں گے۔

چنانچہ جب تیسرا آدمی کھانا لے آیا اور دونوں نے پیٹ بھر کر کھا لیا تو اُنھوں نے کوئی جھگڑا نکال کر لانے والے کو جان سے مار ڈالا۔ پھِر ذرا سی دیر میں زہر کے اثر سے خود بھی مر کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔

گدھا اور گھوڑا

دو شخص کسی شہر سے لاہور روانہ ہوئے جِن میں سے ایک تو گھوڑے اور دوسرا گدھے پر سوار تھا۔ گدھے والے نے کہا۔ ”میاں سوار خاں! سفر میں دو آدمی مل کر چلیں تو ایک دوسرے کی رفاقت سے بہت خوش رہتے ہیں۔ اگر ہم تُم ساتھی ہو جائیں تو راستہ بھی اچھّا کٹے اور منزل پر بھی اکٹھے رہنے سے خوب آرام ملے۔“

سوار نے کہا۔ ”بات تو درست ہے مگر میرا تمہارا ساتھ کیونکر ہو؟ جس راستے کو میں ایک پہر میں طے کروں گا تُم دِن بھر میں بھی مُشکل سے کاٹو گے۔“

گدھے والے نے کہا۔ ”یہ تیزی چند قدموں کی ہوا کرتی ہے۔ منزل پر آپ اور ہم خُدا چاہے صرف گھنٹے آدھ گھنٹے ہی کے وقفے سے پہنچیں گے۔“

اِس پر سوار نے اور بھی ڈِینگ ماری اور آخِر یہ فیصلہ کیا کہ ”اگر آج ہم تُم منزل پر برابر پہنچیں تو آج ہی سے گھوڑا تمہاری سواری کے لیے دے دیا جائے گا اور میں گدھے پر سوار ہو جاؤں گا۔“

اِس فیصلے کو گدھے والے نے بخوشی منظور کر لیا اور دونوں ایک ساتھ چل پڑے۔ مگر گدھے اور گھوڑے کا کیا مُقابلہ؟ گدھے والے نے

کوشش تو بہت کی لیکن سوار تھوڑی ہی دیر میں خاصی دُور نکل گیا اور دوپہر سے پہلے آدھی منزل مار کر ایک تالاب کے کِنارے درختوں کے جھُنڈ میں قدرے آرام لینے کی نیّت سے ٹھہر گیا اور اِس خیال سے کہ گھوڑا بھی خوب چَر چُگ لے اُس کی باگ ڈور ڈھیلی چھوڑ کر کِسی درخت سے اٹکا دی۔ پھر خُود کھانا کھا کہ تازہ پانی پیا۔ اب دُھوپ کی شدّت سے ٹھنڈے سائے میں جو آرام ملا تو دِل میں خیال آیا کہ گدھے والا تو ابھی چوتھائی رستے تک بھی نہ پہنچا ہو گا۔ اِس لیے ذرا کی ذرا لیٹ ہی کیوں نہ لیں۔

سوار خاں لیٹتے ہی سو گئے اور جوانی کی نیند میں دوپہر کے سوئے ہوئے تین ہی بجا کر اُٹھے۔ اِتنے میں گھوڑا بھی باگ ڈور تُڑا کے کہیں کھیت میں دُور نکل گیا تھا۔ یہ اُٹھّے تو گھنٹہ بھر اُس کی تلاش میں بھی صرف ہو گیا۔ اور مُشکل سے چار بجے سوار ہو کر بھاگا بھاگ میں شام کے سات بجے

منزل کی صورت کہیں نظر آئی۔ سرائے میں جا کر جو دیکھا تو گدھے والا گدھے اور گھوڑے کے گھاس دانے اور اپنے اور سوار خاں کے کھانے کا انتظام کر کے چارپائی بچھائے مزے سے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ رات کو دونوں نے آرام کے ساتھ سرائے میں گزاری اور صُبح ہوتے ہی دونوں کی سواریاں تبدیل ہو کر گدھے والا گھُڑ سوار بن گیا اور گھوڑے والا گدھے پر لدنے لگا۔

ایک بھُوکا لکھ پتی

واٹسن نامی ایک لکھ پتی سوداگر ایک دِن صُبح کے وقت کہیں جانے کو تیّار تھا۔ نوکر ناشتے کی میز لگائے مُنتظر کھڑے تھے کہ اِتنے میں ایک بھُوکے بُوڑھے نے آکر سوال کیا۔

"سوداگر صاحب! میں تین دِن سے بھُوکا ہوں۔ کُچھ کھانا ہو تو خُدا کی راہ میں دِلوادو تاکہ میں بھی پیٹ کے دوزخ کو بھَر لُوں۔" واٹسن نے نہایت

کراہت سے کہا۔ ”احمق بُوڑھے! یہ نانبائی کی دُکان نہیں۔“

بُوڑھے نے کہا۔ ”کُچھ پیسے ہی دے دیجیے کہ بازار سے روٹی خرید لوں۔“

واٹسن بولا۔ ”بَس اَب تقریر بازی ختم کر کے فوراً دفع ہو جاؤ۔ ورنہ ابھی کُتّا مزاج پُرسی کرے گا۔“

غِریب خاموش ہو کر نہایت بے دِلی کے ساتھ چلا گیا۔ لیکن واٹسن جوں ہی میز پر بیٹھا اُسے معلوم ہوا کہ کِسی بے احتیاطی سے چائے مکھّن اور میوے کو مٹّی کا تیل لگ گیا ہے اور سب چیزوں سے تیل کی بُو آ رہی ہے۔

یہ کام کی جلدی میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور نوکر کو ایک بجے کھانا لانے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ لیکن تین بج گئے اور نوکر نہ آیا۔ واٹسن بھُوک سے بے تاب ہو رہا تھا کہ اُس کے ایک معزّز دوست نے آ کر کہا۔ ” آپ کا

نوکر ایک بجے کھانا لے کر آ رہا تھا۔ اِتّفاقاً میری موٹر سے ٹکّر لگ گئی کھانا تو برتنوں سمیت گرا ہی تھا، افسوس نوکر کو بھی سخت چوٹ آئی۔ جسے میں اب شفاخانے پہنچا کر اپنے سامنے مرہم پٹّی کرا آیا ہوں۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ نوکر چند روز میں اچھّا ہو جائے گا مگر میں اِس سوءِ اتّفاق کے لیے معافی مانگتا ہوں۔"

واٹسن دوست کو رُخصت کر کے مکان پر آیا اور باورچی کو رات کا کھانا معمول سے قدرے پہلے تیّار کرنے کا حُکم دیا مگر باورچی نے رات کو سر جھُکا کر عرض کی۔ "میں کھانا پکا کر ایک معمولی کام کے لیے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ واپس آ کر جو دیکھتا ہوں تو آپ کے کُتّے نے سب کھانا خراب کر دیا ہے۔" صاحب سخت جھُنجھلائے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ پھَل جو منگائے تو وہ بھی بد بُو دار معلوم ہوئے۔ ناچار بھُوکا سونا پڑا۔ دوسرے دِن صُبح اُٹھ کر چائے تیّار ہوئی تو اُس کی بھی وہی حالت پائی اور

ایک بجے کا کھانا بھی کسی وجہ سے یونہی برباد ہو گیا۔

آخر اِن باتوں کے پےَ درپےَ واقع ہونے سے واٹسن کو خیال آیا کہ ہو نہ ہو بُوڑھے کی بَد دُعا کا نتیجہ ہے۔ ناچار وہ ایک دوست کے ہاں کھانا کھانے چلا گیا۔ لیکن جُونہی دوست کے ساتھ کھانے کو بیٹھا میز پر کھانا رکھتے ہوئے نوکر کا پاؤں پھِسل گیا۔ میز واٹسن پر آ پڑی اور یہ اُس دوست کی میم صاحبہ پر جا گرا۔ اُس کے گرنے سے اُنہیں بھی چوٹ آئی اور کھانا بھی سب کا سب تہ و بالا ہو گیا۔ ناچار واٹسن شرمندہ ہو کر یہ کہتا ہوا اُٹھ آیا کہ "میں اپنی بدنصیبی میں تمہیں ناحق شریک کرنا نہیں چاہتا۔"

اب یہ دُوسری رات تھی جو اُسے فاقے سے بسر کرنی پڑی۔ تیسری صُبح بھوک کے مارے اُس کی حالت سخت ابتر ہو رہی تھی اور یہ حیران بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں کہ اِتنے میں اِتّفاقاً پھر اُسی بُوڑھے فقیر کا اُدھر سے گُزر ہوا۔ واٹسن نے دیکھتے ہی آواز دے کر اُسے پاس

بُلایا اور اپنا سب حال کہہ سُنایا۔

اُس نے کہا۔ ”صاحب! بے شک تمہاری بے رُخی دیکھ کر میں نے ہی پرسُوں خُدا سے دُعا مانگی تھی کہ الہیٰ! تیرا یہ دولت مند بندہ اس فاقے کی مُصیبت کو بالکل نہیں جانتا جو تیرے بھوکے بندوں پر گُزرتی ہے۔ اِس کے بعد مُجھے تو فوراً ایک جگہ سے کُچھ رقم مل گئی۔ مگر اِدھر خُدا نے تمہیں بھی اِس بے پروائی کا مزہ چکھا دیا۔ خیر اب تُم چل کر میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ شاید خدا تمہارا قصور معاف کر دے۔“

بُوڑھے کی بات سُنتے ہی لکھ پتی بھوکا فوراً ساتھ ہو لیا اور اُس کی پُرانی فقیرانہ جھونپڑی میں جا کر خوب پیٹ بھر کر بِسکٹ کھائے اور چائے پینے کے بعد عہد کر لیا کہ آئندہ میں کسی فقیر کا سوال رَد نہ کروں گا۔

بہلول دانا

بہلول نامی ایک بُزرگ غزنی کے رہنے والے تھے۔ یہ اکثر ایسی حرکتیں اور ایسی باتیں کر دیا کرتے تھے جو بظاہر سمجھ میں نہ آتی تھیں۔

بھُوک لگتی تو بھَری مجلس میں کُچھ لے کر کھانا شروع کر دیتے۔ نیند آتی تو

چاہے کوئی امیر یا غریب پاس بیٹھا ہو یہ پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتے۔ اِن باتوں سے بعض لوگ اُنہیں بہلول دیوانہ کہتے تھے اور بعض بہلول دانا۔

ایک دفعہ کسی نے ہنسی سے کہا۔ "بہلول! آپ کو بادشاہ نے گدھوں کا حاکم مقرّر کر دیا ہے۔"

فرمایا۔ "پھر یہیں بندھے رہو۔" یعنی تُم بھی گدھے ہو۔

ایک مرتبہ کسی نے کہا۔ "بہلول! بادشاہ نے تمہیں پاگلوں کی مردُم شماری کا حکم دیا ہے۔"

فرمایا۔ "اِس کے لیے تو ایک دفتر درکار گا۔ ہاں دانا گننے کا ہو تو اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔"

ایک دِن آپ بادشاہ کے پاس گئے۔ جو اُس وقت کُچھ سوچ رہا تھا۔ آپ نے پوچھا۔ "سوچتے کیا ہو؟"

اس نے کہا۔ ”میں اِس وقت دُنیا کی بے وفائی پر غور کر رہا ہوں کہ اِس بے وفا نے کسی سے بھی نباہ نہ کیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر دُنیا وفادار ہوتی تو تُم آج بادشاہ کیونکر بن سکتے۔ بس اِس قصّے کو جانے دو اور کُچھ اور سوچو۔“ ایک دفعہ بارش کی کثرت سے اکثر قبروں میں اَیسے شگاف پڑ گئے کہ مُردوں کی ہڈّیاں اور کھوپڑیاں نظر آنے لگیں۔ بہلول قبرستان میں چند کھوپڑیاں سامنے رکھّے دیکھ رہے تھے کہ اِتّفاقاً بادشاہ کی سواری بھی آ نِکلی۔ اُس نے اُنہیں اِس شغل میں مصرُوف دیکھ کر پوچھا۔ ”بہلول ! یہ کیا دیکھ رہے ہو؟“

آپ نے فرمایا۔ ”تمہارا اور میرا دونوں کا باپ مر چُکا ہے۔ میں اَب یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے باپ کی کھوپڑی کون سی ہے اور میرے باپ کی کون سی؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”کیا مُردہ امیر و غریب اور شاہ و گدا کی ہڈّیوں میں بھی کُچھ فرق ہوا کرتا ہے کہ پہچان لو گے؟“

بہلول نے کہا۔ ”پھر چار دِن کی جھُوٹی نمُود پر بڑے لوگ مغرور ہو کر غریبوں کو حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟“

بادشاہ قائل ہو گیا اور اُس دِن سے اور بھی حلیمی اختیار کر لی۔

حوصلہ

جب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کیا تو دربارِ دہلی کی طرف سے اُن دِنوں میر منّو گورنر مقرّر تھا۔ اِس بے چارے نے پہلے تو دہلی میں امداد کے لیے بہت سی عرضیاں بھیجیں۔ لیکن جب کوئی بھی جواب نہ آیا تو ناچار اپنی ہی مُٹھّی بھر فوج سے احمد شاہ کا مُقابلہ کیا۔ مگر احمد شاہ نے میر صاحب کو شکست دے کر شالامار باغ میں آمقام کیا۔ اب اِن کو اِطاعت

کے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ناچار خود ملنے گئے۔ احمد شاہ اُن کی بہادری اور غیرت دیکھ چُکا تھا۔ عزّت کے ساتھ بِٹھا کر پوچھا۔

احمد شاہ: "میر صاحب! آپ نے لڑائی پہلے ہی اِطاعت کیوں نے قبول کی۔"

میر منّو: "صرف اِس لیے کہ جو میرا آقا ہے اُس کی مرضی کے بغیر میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔"

احمد شاہ: "پھر آپ کے مالک نے آپ کی امداد کیوں نہ فرمائی؟"

میر منّو: "اُس نے خیال کیا ہو گا کہ امداد کے بغیر ہی میں آپ سے بخوبی نِپٹ لوں گا۔"

احمد شاہ: "اچھّا اگر آپ فتح پاتے تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟"

میر منّو: "میں آپ کو لوہے کی ایک بند گاڑی میں بِٹھا کر دہلی بھیج دیتا

وہاں بادشاہ سلامت آپ کی بابت جو چاہتے خُود حکم دیتے۔"

احمد شاہ: "اچھّا اَب کہ خُدا نے مُجھے فتح مند کیا ہے، مُجھے آپ سے کیا سلوک کرنا چاہیے؟"

میر منّو: "اگر آپ قصائی ہیں تو قتل کر دیجیے۔ ڈاکو ہیں تو لوٹ لیجیے۔ سوداگر ہیں تو جُرمانہ کر دیجیے اور بادشاہ ہیں تو معاف فرما دیجیے۔"

میر صاحب کی راست بازی اور حاضر جوابی سے احمد شاہ اِتنا خوش ہوا کہ سوا لاکھ کا خِلعت دے کر اپنی طرف سے بھی اِنہی کو بدستور پنجاب کا گورنر مقرّر کر دیا اور کُچھ سالانہ خراج پر صُلح کر لی۔ واقعی حوصلہ اور صداقت بڑی چیز ہے۔

خلیفۂ بغداد اور ہندی وید

خلیفۂ بغداد نے ہندوستان کے کسی مشہور وید کو اپنے یہاں طلب فرمایا اور وید صاحب دربار میں پہنچے تو عِلم کی تعظیم کے لیے خلیفہ ادب سے کھڑا ہو گیا۔

بیٹھنے کے بعد وید نے نہایت ادب کے ساتھ تین چیزیں بادشاہ کے

سامنے تحفے کے طور پر پیش کر کے عرض کی۔ ”جہاں پناہ! حضور کی نذر کے لیے یہ وہ تین چیزیں حاضر ہیں جِن کی ہر بادشاہ کو سخت ضرورت اور تلاش ہوا کرتی ہے۔“

اِن میں ایک تو خضاب ہے جو سفید بالوں کو سیاہ اور بُوڑھے کو جوان کر دِکھاتا ہے۔ دوسری ہاضمے کی ایک معجون ہے کہ کھانے کے بعد ماشہ بھَر کھالی جائے تو معدہ ہر قِسم کی خرابیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ تیسری ایک طاقت دینے والا کُشتہ ہے جو عُمر بھر بُڑھاپے کو پاس نہ آنے دے۔

خلیفے نے تینوں کی تعریف سُن کر فرمایا۔” وید صاحب! میں تو آپ کی قابلیت اور شُہرت سے کُچھ زیادہ اُمّید رکھتا تھا مگر افسوس کہ آپ نے وہ خِیال غَلَط کر دیا۔ یہ تینوں چیزیں جو آپ نایاب تُحفے سمجھ کر لائے ہیں۔ غَور کیجیے تو صِرف فانی جِسم کے لیے لذّتیں پیدا کرنے والی ہیں۔“

خِضاب تو غُرور پیدا کرے گا۔ جِس سے انسان بُڑھاپے میں بھی جوانی کے وَلولوں سے باز نہ آئے گا۔ ایسا ہی معجُون کا اِستعمال بھی معجُون کے لیے زیبا ہے۔ کیونکہ جو شخص بھُوک سے زیادہ کھا کر دُکھ اُٹھاتا ہے کِسی طرح عقل مند نہیں کہلا سکتا۔ اِسی طرح کُشتہ ایک فضُول چیز ہے کہ قوّتِ جسمانی کا انجام وحشت ہُوا کرتا ہے۔ اور وحشی بَننا عقلمندی میں داخل نہیں۔ انسانیت کے لیے تو صرف اخلاقی قوّت درکار ہے اور حُکّام کو عوام کی نِسبت اُسی کی زِیادہ ضُرورت بھی ہوا کرتی ہے۔ اگر آپ حُکّام کو اَیسی لذّتوں میں مُبتلا کر دیں گے تو اُن سے مخلوق کی خِدمت کیا ہو سکے گی۔"

ختم شد